ماہنامہ
جہد حق
پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
HRCP

جلد نمبر27......شمارہ نمبر06 ...... جون 2020
(قیمت10 روپے)
Monthly JUHD-E-HAQ - June-2020 - Registered No. CPL-13

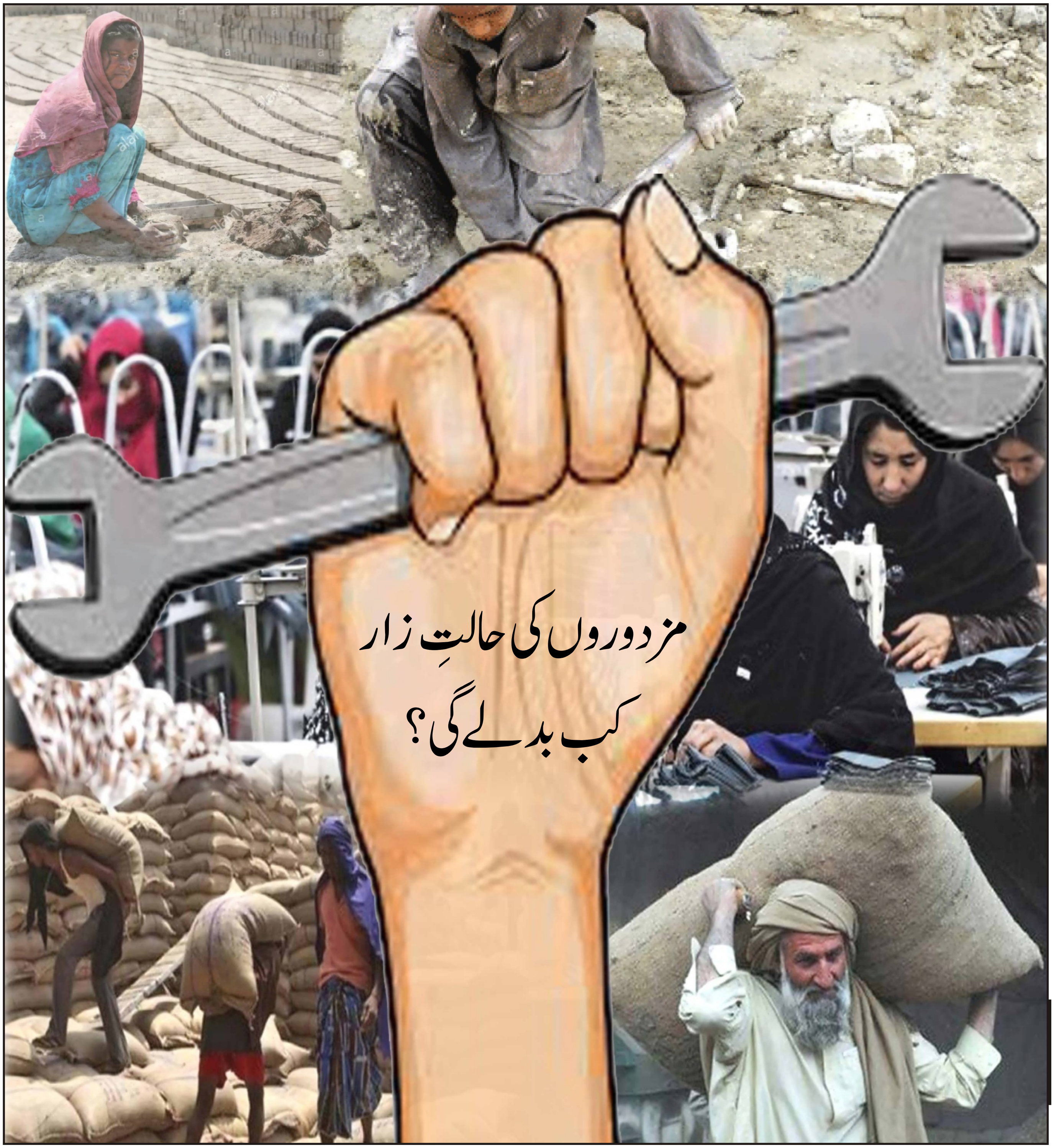

انسانی حقوق کا عالمی منشور

10 دسمبر 1948ء کو اقوام عالم نے انسانی حقوق کا مندرجہ ذیل عالمی منشور منظور کیا

دفعہ - 1 تمام انسان آزاد اور حقوق وعزت کے اعتبار سے برابر پیدا ہوئے ہیں۔ انھیں ضمیر اور عقل ودیعت ہوئی ہے۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھائی چارے کا سلوک کرنا چاہیے۔

دفعہ - 2 ہر شخص ان تمام آزادیوں اور حقوق کا مستحق ہے جو اس اعلان میں بیان کیے گئے ہیں اور اس حق پر نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب اور سیاسی تفریق کا یا کسی قسم کے عقیدے، قومیت، معاشرے، دولت یا خاندانی حیثیت وغیرہ کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

اس کے علاوہ کسی بھی شخص کے ساتھ اس کے علاقے یا ملک کی، سیاسی، عملی یا بین الاقوامی حیثیت کی بناء پر کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ ملک یا علاقہ آزاد ہو یا تولیتی ہو یا غیر مختار ہو یا اقدار اعلیٰ کے لحاظ سے کسی اور بندش کا پابند ہو۔

دفعہ - 3 ہر شخص کو اپنی آزادی، زندگی اور تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 4 کوئی شخص، غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جاسکے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی، چاہے اس کی کوئی بھی شکل ہو، ممنوع ہوگی۔

دفعہ - 5 کسی شخص کو جسمانی اذیت، یا ظالمانہ انسانیت سوز، یا ذلت آمیز سزا نہیں دی جائے گی۔

دفعہ - 6 ہر شخص کا حق ہے کہ ہر جگہ اس کی قانونی حیثیت کو تسلیم کیا جائے۔

دفعہ - 7 قانون کی نظر میں سب برابر ہیں اور سب بغیر کسی تفریق کے قانون کے اندر امان پانے کے برابر کے حق دار ہیں۔ اس اعلان کی خلاف ورزی میں جو بھی تفریق کی جائے یا جس تفریق کی بھی ترغیب دی جائے، اس سے بچاؤ کے سب برابر کے حقدار ہیں۔

دفعہ - 8 ہر شخص کو ان فعال کے خلاف جو دستور یا قانون میں دیے ہوئے بنیادی حقوق کی نفی کرتے ہوں، بااختیار قومی عدالتوں سے موثر طریقے سے چارہ جوئی کرنے کا حق ہے۔

دفعہ - 9 کسی شخص کو من مانے طور پر گرفتار، نظر بند، یا جلاوطن نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 10 ہر شخص کو یکساں طور پر حق حاصل ہے کہ اس کے حقوق و فرائض کے تعین یا اس کے خلاف کسی عائد کردہ جرم کے فیصلے کے بارے میں اسے ایک آزاد اور غیر جانب دار عدالت میں کھلی اور منصفانہ سماعت کا موقع ملے۔

دفعہ - 11 (1) ایسے ہر شخص کو جس پر کوئی فوجداری الزام عاید کیا جائے، اس وقت تک بے گناہ شمار کیے جانے کا حق ہے جب تک کہ اس پر کھلی عدالت میں قانون کے مطابق جرم ثابت نہ ہو جائے اور اسے اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع اور تمام ضمانتیں نہ دی جاسکی ہوں۔

(2) کسی شخص کو کسی ایسے فعل یا فروگزاشت کی بناء پر جو ارتکاب کے وقت قومی یا بین الاقوامی قانون کے اندر تعزیری جرم شمار نہیں کیا جاتا تھا، کسی تعزیری جرم میں ماخوذ نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کوئی ایسی سزا دی جائے گی جو جرم کے ارتکاب کے وقت کی مقرر کردہ سزا سے زائد ہو۔

دفعہ - 12 کسی شخص کی نجی زندگی، خانگی زندگی، گھر بار، خط و کتابت میں من مانے طریقے پر مداخلت نہ کی جائے اور نہ ہی اس کی عزت اور نیک نامی پر حملے کیے جائیں گے۔ ہر شخص کو ایسے حملے یا مداخلت سے قانونی تحفظ کا حق ہے۔

دفعہ - 13 (1) ہر شخص کو اپنی ریاست کی حدود کے اندر نقل و حرکت کرنے اور کہیں بھی سکونت اختیار کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ کسی ملک سے چلا جائے چاہے یہ ملک اس کا اپنا ہو اور اسی طرح اسے اپنے ملک میں واپس آجانے کا بھی حق ہے۔

دفعہ - 14 (1) ہر شخص کو عقیدے کی بنا پر ایذا رسانی سے بچنے کے لیے دوسرے ملکوں میں پناہ حاصل کرنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے۔

(2) یہ حق ان عدالتی کاروائیوں سے بچنے کے لیے استعمال میں نہیں کیا جاسکتا جو خالصتاً غیر سیاسی جرائم یا ایسے افعال کی وجہ سے عمل میں آتی ہیں جو اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف ہیں۔

دفعہ - 15 (1) ہر شخص کو قومیت کا حق ہے۔

(2) کوئی شخص محض من مانے طور پر قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی اس کو اپنی قومیت تبدیل کرنے کا حق دینے سے انکار کیا جائے گا۔

دفعہ - 16 (1) بالغ مردوں اور عورتوں کو بغیر ایسی پابندی کے جو نسل، قومیت، یا مذہب کی بنا پر لگائی جائے شادی بیاہ کرنے اور گھر بسانے کا حق ہے۔ مردوں اور عورتوں کو نکاح، ازواجی زندگی اور نکاح کو فسخ کرنے کے معاملے میں برابر کے حقوق حاصل ہیں۔

(2) نکاح فریقین کی پوری آزادی اور رضامندی سے ہوگا۔

(3) خاندان، معاشرے کی فطری اور بنیادی اکائی ہے اور وہ معاشرے اور ریاست دونوں کی طرف سے حفاظت کا حقدار ہے۔

دفعہ - 17 (1) ہر انسان کو تنہا یا دوسروں سے مل کر جائیداد رکھنے کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو زبردستی اس کی جائیداد سے محروم نہیں کیا جائے گا۔

دفعہ - 18 ہر انسان کو آزادی فکر، آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب اور عقیدے کو تبدیل کرنے اور اجتمائی یا انفرادی طور پر خاموشی یا کھلے بندوں اپنے عقیدے کی تبلیغ، اس پر عمل، اور اس کی عبادات اور رسومات پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ - 19 ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اور بلا کسی قسم کی مداخلت کے اپنی رائے پر قائم رہے اور جس ذریعے سے چاہے اور ملکی سرحدوں کے حائل ہوئے بغیر معلومات اور خیالات کا حصول اور ان کی ترسیل کرے۔

دفعہ - 20 (1) ہر شخص کو پرامن طریقے سے ملنے جلنے اور انجمنیں قائم کرنے کی آزادی کا حق ہے۔

(2) کسی شخص کو کسی انجمن میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

دفعہ - 21 (۱) ہر شخص کو اپنے ملک کی حکومت میں براہ راست یا آزادانہ طور پر منتخب کیے ہوئے نمائندوں کے ذریعے حصہ لینے کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو اپنے ملک میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا برابر کا حق ہے۔

(3) عوام کی مرضی حکومت کے اقتدار کی بنیاد ہوگی۔ یہ مرضی وقتاً فوقتاً ایسے حقیقی انتخابات کے ذریعے ظاہر کی جائے گی جو عام اور مساوی رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوں گے اور جو خفیہ ووٹ یا اس کے مماثل کسی دوسرے آزادانہ طریقہ رائے دہندگی کے مطابق عمل میں آئیں گے۔

دفعہ - 22 معاشرے کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کو معاشرتی تحفظ کا حق حاصل ہے اور یہ حق بھی وہ ملک کے نظام اور وسائل کے مطابق قومی کوشش اور بین الاقوامی تعاون سے ایسے اقتصادی، معاشرتی اور ثقافتی حقوق کو عملاً حاصل کرے، جو اس کی عزت اور شخصیت کی آزادانہ نشونما کے لیے لازم ہیں۔

دفعہ - 23 (1) ہر شخص کو کام کاج، روزگار کے آزادانہ انتخاب، کام کاج کی مناسب و معقول شرائط اور بے روزگاری کے خلاف تحفظ کا حق ہے۔

(2) ہر شخص کو کسی تفریق کے بغیر مساوی کام کے لیے مساوی معاوضے کا حق ہے۔

(3) ہر شخص جو کام کرتا ہے وہ ایسے مناسب و معقول مشاہرے کا حق رکھتا ہے جو خود اس کے اور اس کے اہل وعیال کے لیے باعزت زندگی کا ضامن ہو اور جس میں اگر ضروری ہو تو معاشرتی تحفظ کے دوسرے ذریعوں سے اضافہ کیا جاسکے۔

(4) ہر شخص کو اپنے مفاد کے بچاؤ کے لیے تجارتی انجمنیں، (ٹریڈ یونین) قائم کرنے اور اس میں شریک ہونے کا حق حاصل ہے۔

دفعہ - 24 ہر شخص کو آرام اور فرصت کا حق ہے جس میں کام کے گھنٹوں کی حد بندی اور تنخواہ کے ساتھ مقررہ وقفوں پر تعطیلات میں شامل ہیں۔

دفعہ - 25 (1) ہر شخص کو اپنی اور اپنے اہل وعیال کی صحت اور فلاح و بہبود کے لیے مناسب معیار زندگی کا حق ہے جس میں خوراک، پوشاک، مکان اور علاج کی سہولتیں اور دوسری ضروری معاشرتی مراعات، اور بیروزگاری، بیماری، معذوری، بیوگی، بڑھاپا اور ان حالات میں روزگار سے محرومی جو اس کے قبضہ قدرت سے باہر ہوں، کے خلاف تحفظ کا حق شامل ہے۔

(2) زچہ اور بچہ خاص توجہ اور امداد کے حق دار ہیں۔ تمام بچے خواہ وہ شادی کے بغیر پیدا ہوئے ہوں یا شادی کے بعد، معاشرتی تحفظ سے یکساں طور پر مستفید ہوں گے۔

دفعہ - 26 (1) ہر شخص کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم کم سے کم ابتدائی اور بنیادی درجوں میں مفت ہوگی۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کرنے کا عام انتظام کیا جائے گا اور لیاقت کی بنا پر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا سب کے لیے مساوی طور پر ممکن ہوگا۔

(2) تعلیم کا مقصد انسانی شخصیت کی پوری نشونما ہوگا اور وہ انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے احترام میں اضافہ کرنے کا ذریعہ ہوگی۔ وہ تمام قوموں اور نسلی یا مذہبی گروہوں کے درمیان باہمی مفاہمت، رواداری اور دوستی کو ترقی دے گی اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی سرگرمیوں کو آگے بڑھائے گی۔

(3) والدین کو اس بات کے تصفیہ کا اولین حق ہے کہ ان کے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دی جائے گی۔

دفعہ - 27 (1) ہر شخص کو قوم کی ثقافتی زندگی میں آزادانہ حصہ لینے، فنون لطیفہ سے مستفید ہونے اور سائنس کی ترقی اور اس کے فوائد میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

(2) ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اس کے ان اخلاقی اور مادی مفادات کا تحفظ کیا جائے جو اسے ایسی سائنسی، فنی یا ادبی تصنیف سے، جس کا وہ مصنف ہے، حاصل ہوتے ہیں

دفعہ - 28 ہر شخص ایسے معاشرتی اور بین الاقوامی نظام کا حقدار ہے جس میں وہ تمام آزادیاں اور حقوق حاصل ہوسکیں جو اس اعلان میں شامل ہیں۔

دفعہ - 29 (1) ہر شخص پر معاشرے کے حق ہیں کیونکہ معاشرے میں رہ کر اس کی شخصیت کی آزادانہ اور پوری نشونما ممکن ہے۔

(2) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے اور ایک جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کی گئی ہوں۔

(3) یہ حقوق اور آزادیاں کسی حالت میں بھی اقوام متحدہ کے مقاصد اور اصولوں کے خلاف عمل میں نہیں لائی جا سکتیں۔

دفعہ - 30 اس اعلان کی کسی چیز سے کوئی ایسی بات مراد نہیں لی جاسکتی جس سے کسی ملک، گروہ یا شخص کو کسی ایسی سرگرمی میں مصروف ہونے یا کسی ایسے کام کو انجام دینے کا حق پیدا ہو جس کا منشا ان حقوق اور آزادیوں کی نفی ہو جو یہاں پیش کی گئی ہیں۔

فہرست

پریس ریلیزیں 03

چند اچھے انسان 05

وبا پر یقین نہ کرنے کے بارے میں...... 06

نرسوں کا عالمی دن: کورونا کے خلاف جنگ میں
فرنٹ لائن پر لڑنے والوں کو سلام 07

2020 کی لاپتہ عید 08

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا 09

آفریت کے ساتھ جینا سیکھیے 11

جبری مزدوری......استحصال کی بدترین شکل 12

وہم وگمان سے ماورا دنیا 17

اقلیتی کمیشن میں شامل ہونے کی درخواست
نہیں کی، جماعت احمدیہ 18

ملک میں سال کی پہلی سہ ماہی خواتین
پر تشدد میں 360 فیصد تک اضافہ 20

زبان کی پابندی سے احتیاط کیجیے،
بچے جس زبان میں چاہے پڑھنے دیجیے! 21

جیلوں میں ملاقات پر پابندی
قیدیوں کی بھوک ہڑتال 22

حکومتی ردعمل لائق تحسین ہے، مگر رپورٹ کے نتائج حقائق پر مبنی ہیں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے اپنی سالانہ رپورٹ 2019 میں انسانی حقوق کی صورت حال پر وزارت انسانی حقوق کے باضابطہ ردعمل کو خوش آئند قرار دیا ہے۔ وزارت کے بیان میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ایچ آر سی پی نے بعض اہم معاملات اجاگر کیے ہیں۔ حکومت اور انسانی حقوق کے خودمختار اداروں کے درمیان بامعنی میل جول کے لیے یہ ایک حوصلہ افزاء پیش رفت ہے۔

البتہ، وزارت کے ردعمل میں حقائق سے متعلق چند غلطیاں ہیں جن کی درستگی ضروری ہے۔ وزارت کے مشاہدات کے برعکس، رپورٹ میں بچوں سے زیادتی کے خاتمے کے تناظر میں زینب الرٹ، ریکوری و ریسپانس بل 2019 کا خاص ذکر کیا گیا ہے (صفحات نمبر 7230)۔ مارچ 2020 میں اس بل کی منظوری ہوئی تھی جس کا ذکر ایچ آر سی پی کی 2020 کی رپورٹ میں کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ، رپورٹ میں اُس کمیشن کا حوالہ موجود ہے جو قیدیوں کی شہری آزادیوں کے مشاہدے کے لیے اسلام آباد ہائی کورٹ کے حکم پر تشکیل دیا گیا تھا (صفحہ 216)؛ ایچ آر سی پی کے دو سینئر اراکین بھی اس کمیشن کا حصہ ہیں۔ آسیہ بی بی اور وجیہہ الحسن کی توہین رسالت کے مقدمات میں رہائی بھی رپورٹ کا حصہ ہے (صفحات 12,40,209)، اور کرتار پور راہداری کھلنے کا بھی ذکر کیا گیا ہے (صفحات 10,33,36)۔ اسی طرح، صحافیوں اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ افراد کے تحفظ کا ایکٹ 2020 میں منظور ہو گیا تو اُسے بھی پوری طرح تسلیم کیا جائے گا۔

ایچ آر سی پی کی رپورٹ میں سال 2019 کے دوران وفاق کے زیرِ انتظام علاقوں اور صوبوں میں انسانی حقوق کی صورت حال کی مجموعی تصویر پیش کی گئی ہے نہ کہ صرف کسی ایک سرکاری وزارت کی کارکردگی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کمیشن کی اس کاوش کا واحد مقصد ریاست اور موجودہ حکومت کو اُن کی آئینی ذمہ داریوں اور عالمی وعدوں کی یاددہانی کروانا ہے۔ ایچ آر سی پی اپنی رپورٹ کے نتائج پر قائم ہے اور امید کرتا ہے کہ حکومت اُن تحفظات کا ازالہ کرے گی جنھیں رپورٹ میں اجاگر کیا گیا ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 03 مئی 2020]

ایچ آر سی پی نے قومی اقلیتی کمیشن کی تشکیل پر تحفظات کا اظہار کیا ہے

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے وزارت مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی کی سَمری پر کابینہ کے فیصلے کے ذریعے قومی اقلیتی کمیشن کی تشکیل ہونے پر شدید تحفظات کا اظہار کیا ہے۔ مجوزہ تشکیل تمام متعلقہ فریقین کی شمولیت کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چونکہ یہ کمیشن کسی قانون سازی کے نتیجے میں قائم نہیں ہوا اس لیے یہ قومی کونسل برائے اقلیتی حقوق کا متبادل ثابت نہیں ہوسکتا جس کے قیام کا حکم 2014 میں عدالت عظمیٰ کے تاریخ ساز تصدق جیلانی فیصلے میں دیا گیا تھا۔ حالیہ کمیشن میں، نوکرشاہی کے حاضر سروس افسران اور اکثریتی برادری کے نمائندوں کی بڑی تعداد نے اقلیتی نمائندگی کو غیر مؤثر کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ، جماعت احمدیہ کو نمائندگی لینے پر سوچ بچار کرنے کا موقع تک نہ دینا عقیدے کی بنیاد پر ظلم وستم کی طویل اور افسوسناک داستان کو جان بوجھ کر نظرانداز کرنے کے مترادف ہے۔

ایچ آر سی پی کا دیرینہ مطالبہ ہے کہ 2014 کے عدالتی فیصلے کی روح کے عین مطابق پارلیمان کے قانون کے ذریعے اقلیتوں کے لیے قومی کونسل یا کمیشن بنایا جائے۔ ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے ایسا ادارہ بنانے کے لیے قانون سازی کرے، مگر اس کے ساتھ ساتھ ہم حکومت سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ وہ عدالت عظمیٰ میں جمع کروائی گئی شعیب سڈل رپورٹ پر بھی توجہ دے جس میں کہا گیا ہے کہ وزارت مذہبی امور 2014 کے عدالتی فیصلے کے اطلاق میں پوری طرح سنجیدہ نہیں ہے۔ اب ذمہ داری ریاست پر ہے کہ وہ پارلیمان کے ایک مؤثر قانون کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 09 مئی 2020]

پاکستان انسانی حقوق کمیشن کا این سی ایچ آر کی بحالی کا مطالبہ

قومی کمیشن برائے انسانی حقوق (این سی ایچ آر) کی بحالی میں حکومتی عدم دلچسپی پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) کے لیے شدید مایوسی کا باعث ہے۔ این سی ایچ آر ایک برس پہلے اپنے چیئر پرسن کی مدت ختم ہو جانے کے بعد سے اب تک غیر فعال ہے۔ نہ تو چیئر پرسن اور نہ ہی کمیشن کے دیگر اراکین کو توسیع دی گئی، اور نہ اُن کی جگہ نئی تقرریاں کی گئی ہیں۔ ایک آئینی ادارہ ہونے کی حیثیت سے، این سی ایچ آر پر ایک اہم کردار ادا کرنے کی ذمہ داری عائد ہے یہ یقینی بنانے کے لیے کہ پاکستان انسانی حقوق سے متعلق اپنے اُن وعدوں کا پاس و لحاظ کرے جو اس نے اپنے شہریوں کے ساتھ کر رکھے ہیں اور جن کی ضمانت دستور میں دی گئی ہے۔ این سی ایچ آر کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ آیا پاکستان اُن عالمی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو رہا ہے جنہیں نبھانے کا اس نے عہد کر رکھا ہے۔

ایچ آر سی پی کا خیال ہے کہ این سی ایچ آر اور قومی کمیشن برائے حقوق نسواں جو کہ این سی ایچ آر کی ہی طرح کئی ماہ سے غیر فعال ہے، جیسے اداروں کی بحالی میں طویل تاخیر ایسے معاملات میں سرکار کی غلط ترجیحات کی عکاسی کرتی ہے جو پیرس اصولوں کی روشنی میں انسانی حقوق کے خود مختار نظام کی تشکیل سے تعلق رکھتے ہیں۔ قومی کمیشن برائے حقوق اطفال جس کا نوٹیفکیشن فروری میں جاری ہوا، کو بھی جلد از جلد فعال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ، قومی اقلیتی کمیشن جسے حال ہی میں ایک انتظامی حکمنامے کے ذریعے تشکیل دیا گیا ہے، کو ختم کیا جائے اور عدالت عظمٰی کے 2014 کے (جیلانی) فیصلے کی روح کے عین مطابق قومی کونسل برائے اقلیتی حقوق کے لیے درکار قانون سازی کی طرف پیش رفت کی جائے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 18 مئی 2020]

وزیرستان میں 'عزت' کے نام پر ہونے والے سفاکانہ قتل قابلِ مذمت ہیں

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق (ایچ آر سی پی) نے وزیرستان کے ایک گاؤں میں دو نوعمر لڑکیوں کے سفاکانہ قتل کی شدید مذمت کی ہے۔ اطلاعات کے مطابق، مقتولہ لڑکیوں کی سوشل میڈیا پر ایک ویڈیو منظر عام پر آنے کے بعد اُن کے خاندان کے کسی فرد نے اُنہیں 'عزت' کے نام پر قتل کر دیا۔

فوجداری قانون (ترمیمی) (عزت کے نام پر ہونے والے جرائم) ایکٹ 2016 کی منظوری کے باوجود، ایسے کوئی شواہد دستیاب نہیں جو ظاہر کر سکیں کہ 'عزت' کے نام پر جرائم کی تعداد اور قبولیت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ اس قسم کے فرسودہ اور انتہائی خطرناک تصورات ابھی بھی رائج ہیں کہ 'عزت' عورتوں کے جسم سے جڑی ہوئی ہے اور 'عزت' کے نام پر جرائم اب بھی پاکستان بھر میں پیش آ رہے ہیں، اور حال یہ ہو کہ مجرم 'عزت' کے نام پر جرائم سرزد کیے جا رہے ہوں اور اُنہیں محاسبے سے بھی تحفظ حاصل ہو تو پھر تبدیلی کے لیے صرف قوانین کی منظوری ہی کافی نہیں ہوتی بلکہ اور بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ پدرشاہی نظام جو اتفاقی جنسی تعلق کا علمبردار ہے وہی پدرشاہی نظام ہے جو 'عزت' کے نام پر جرائم کو جائز قرار دینے کے لیے، اُن کی حمایت کے لیے اور اُنہیں سرزد کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی قابل قبول نہیں ہے۔

ایچ آر سی پی کو یہ جان کر بھی شدید تشویش ہوئی ہے کہ کئی ایسے لوگوں کو دھمکایا گیا اور اُن کا مذاق اڑایا گیا ہے جنہوں نے سوشل میڈیا پر وزیرستان میں ہونے والے دہرے قتل کے خلاف آواز اٹھائی۔ ریاست کو ہر ایک شخص پر واضح کرنا ہوگا کہ وہ اس بہیمانہ روایت کی حمایت کو کسی صورت برداشت نہیں کرے گی۔

مقامی انتظامیہ کو ویڈیو میں نظر آنے والی تیسری لڑکی اور ایک شخص کے تحفظ اور مجرموں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لیے تمام ممکنہ اقدامات کرنے ہوں گے۔ ریاست کو سابق وفاقی انتظامی قبائلی علاقوں میں انسانی حقوق کے تحفظ کا عزم ظاہر کرنے کے لیے بھی ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ یہ یقینی ہو سکے کہ انسانی سلامتی کو 'قومی سلامتی' پر ترجیح حاصل ہے۔

[پریس ریلیز۔ لاہور۔ 17 مئی 2020]

جہد حق پڑھنے والے توجہ کریں

- آپ نے اس شمارہ کا مطالعہ کیا۔ جو خامیاں / کمزوریاں آپ کو نظر آئی ہوں۔ ان کی نشاندہی خط کے ذریعے سے کیجئے۔
- آپ بھی اپنے علاقے میں ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی رپورٹ / اطلاع ہمیں اس رسالہ میں چھپنے والا رپورٹ فارم پُر کر کے بذریعہ ڈاک روانہ کر سکتے ہیں۔ حقائق اچھی طرح سے تصدیق کر کے لکھیں۔

پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق

''ایوان جمہور'' 107 - ٹیپو بلاک،

نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

HRCP کارکن متوجہ ہوں

''جہد حق'' کے لیے رپورٹ فارم کے مطابق کوائف پر مبنی رپورٹیں، خبریں، تصاویر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے متعلق دیگر مواد مہینے کے تیسرے ہفتے تک پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق کے مرکزی دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تاکہ یہ اگلے شمارے میں شائع کیا جا سکے۔

جہد حق کا تازہ شمارہ اور پچھلے شمارے ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ پتہ:

www.hrcp-web.org

چند اچھے انسان!

رؤف کلاسرا

راشد رحمٰن سے آخری ملاقات ملتان میں شاید بارہ برس قبل ہوئی تھی اور اب کبھی نہیں ہوگی۔

1996ء میں ملتان میں نوجوان ایڈوکیٹ راشد رحمٰن سے ملا تو میں نے اپنی زندگی کے جن چند اچھے لوگوں کی فہرست بنائی ہوئی تھی، اس میں اس کا نام بھی لکھ دیا۔

اسی راشد رحمٰن کو اگلے روز ملتان میں ان کے چیمبر میں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا کیونکہ وہ بہاؤالدین یونیورسٹی کے ایک لیکچرر کے وکیل تھے جس پر توہین رسالت کا الزام تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق مخالف وکیل نے ہی جج کے سامنے راشد رحمٰن کو دھمکی دی تھی کہ اگر تم اس کیس سے دستبردار نہ ہوئے تو مارے جاؤ گے۔ چلیں پاکستان میں کوئی تو اپنی زبان کا پکا نکلا اور راشد رحمٰن اگلی پیشی پر پیش ہونے کے لیے زندہ نہیں رہا۔

امریکہ میں راشد رحمٰن کے قتل کی خبر سن کر میرے آنسو بہہ نکلے۔ ملتان کی جدوجہد اور سخت دنوں کی پرانی یادیں حملہ آور ہوئیں۔ راشد رحمٰن بھی برے دنوں کے ساتھیوں میں سے ایک تھا۔

کچھ دن پہلے ہی ارشد شریف کو کہا تھا... یار انسان کی زندگی کا مزہ بس چالیس برس کی عمر تک ہی ہے۔ باقی سب بکواس ہے۔ کلینکل موت تو چالیس پر ہوجاتی ہے، باقی توڑ پھوڑ کا عمل ہے جو اگلے دس بیس برس چلتا رہتا ہے۔ انسانی اعضا جواب دینا شروع کر دیتے ہیں۔ آگاہی اور شعور علیحدہ تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ زندگی رک سی جاتی ہے۔ چالیس کے بعد زندگی میں موت کا عنصر بڑھنے لگتا ہے۔ کبھی ماں تو کبھی باپ تو کبھی بڑا بھائی تو کبھی چاچا یا ماموں۔ خاندان کے بعد دوستوں کی باری لگتی ہے تو آپ کو موت اپنے قریب محسوس ہوتی ہے۔ زندگی میں دلچسپی ختم ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ ماضی کی یادیں ستانا شروع کر دیتی ہیں اور آپ سنکی ہونے لگتے ہیں۔ چڑچڑاہٹ بڑھ جاتی ہے۔ کسی سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا اور دل چاہتا ہے سردیوں میں کہیں دھوپ میں چارپائی ڈال کر سوئے رہیں۔ گرمیوں میں کسی درخت کے سائے تلے اکیلے گھنٹوں کرسی ڈال کر خالی نظروں سے آسمان کو تکتے رہیں... رہی سہی کسر بچوں کے بڑے ہونے سے پوری ہوجاتی ہے۔ اپنی محبتوں اور دوستوں کو مرتے دیکھ کر کون کب تک زندہ رہ سکتا ہے۔ بالآخر یہ جذباتی توڑ پھوڑ ایک دن آپ کو قبر میں اتار دیتی ہے۔

عمر کے وہی پہلے چالیس برس ہی ہیں جو ہم خوشی خوشی جیتے ہیں۔ باقی کے برس تو موت کی طرف کا ایک سفر ہے جو نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں طے کرنا ہے۔

راشد رحمٰن سے نہ ملا ہوتا تو شاید میں زندگی میں انسانی حقوق کے معنی سے روشناس نہ ہوتا اور نہ ہی انسانوں کا دکھ محسوس کرتا۔ راشد رحمٰن سے پہلی ملاقات میں ہی میں ان کا گرویدہ ہوگیا تھا۔ چہرے پر خوبصورت مسکراہٹ، ایک خوبصورت شخصیت کا مالک نوجوان، آواز میں ایک خاص کھنک... جس کے چہرے پر جتنی شگفتگی اور محبت تھی وہ اندر سے اتنا ہی فولادی تھا۔ کمزور انسانوں کے دفاع کے لیے وہ کسی سے بھی ٹکرا سکتا تھا۔

میں نے نیا نیا ڈان اخبار جوائن کیا تھا کہ مجھے اسٹوریز کی تلاش راشد رحمٰن تک لے گئی۔ پتہ چلا وہ آئی اے رحمٰن کے بھتیجے تھے اور انسانی حقوق کمیشن ملتان کے سربراہ بھی تھے۔ ان کے دفتر میں جہاں اچھی چائے ملتی، وہیں گپ شپ اور انسانوں کے ساتھ ہونے والے بدترین سلوک کی کہانیوں کا پتہ بھی چلتا رہتا۔ ان کے پاس سرائیکی علاقے میں ہونے والے ہر ظلم، ہر ستم کا

راشد رحمٰن کو علم تھا کہ ہمارے معاشرے میں طاقتور کی اپنی زبان اور اپنا انصاف ہوتا ہے۔ وہ اچھے انسانوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے وکالت کا پیشہ دولت کمانے کے لیے اختیار نہیں کیا تھا۔ میں خود گواہ ہوں کہ انہوں نے کتنے مظلوموں کی مدد کی۔ ان کے مفت مقدمات بھی لڑتے اور الٹا اپنی جیب سے انہیں کرایہ دے کر گاؤں واپس بھیجتے۔

ریکارڈ موجود تھا۔ عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور تشدد کی وہ ایک علیحدہ فائل رکھتے اور ہر سال جب میں نے خواتین کے عالمی دن پر کوئی اسٹوری دینی ہوتی تو وہ مجھے فائل تھما دیتے۔

راشد رحمٰن کے بڑوں نے ہندوستان سے ہجرت کے بعد کراچی یا لاہور کی بجائے ملتان میں رہنے کو کیوں ترجیح دی؟ اس سوال کا جواب راشد کے پاس تو نہ تھا کیونکہ وہ پاکستان بننے کے بعد پیدا ہوئے تھے، تاہم وہ رویوں سے پورے ملتانی تھے۔ ان کے والد اشفاق احمد خان بھٹو دور میں ویت نام کے سفیر رہے۔ اگرچہ وہ شستہ اور خوبصورت اردو بولتے لیکن ہمارے ساتھ سرائیکی بھی بولتے کہ کہیں یہ نہ محسوس ہو کہ ملتان رہتے ہوئے بھی ملتانی زبان اور تہذیب سے آشنائی نہ کی۔

راشد رحمٰن کو علم تھا کہ ہمارے معاشرے میں طاقتور کی اپنی زبان اور اپنا انصاف ہوتا ہے۔ وہ اچھے انسانوں کی اس نسل سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے وکالت کا پیسہ دولت کمانے کے لیے اختیار نہیں کیا تھا۔ میں خود گواہ ہوں کہ انہوں نے کتنے مظلوموں کی مدد کی۔ ان کے مفت مقدمات بھی لڑتے اور الٹا اپنی جیب سے انہیں کرایہ دے کر گاؤں واپس بھیجتے۔

میں جوں جوں راشد رحمٰن کے قریب ہوتا گیا، محسوس ہوا کہ مجھے اپنی فہرست میں ایک اور اچھے انسان کا اضافہ کر لینا چاہیے۔ ایک دن میں نے کہا، کراچی جانا ہے۔ میں ایک رپورٹ پر کام کر رہا تھا۔ بولے، چلو چلتے ہیں۔ میرے اپنے کئی عزیز وہیں ہیں۔ ان سے بھی ملاقات ہوجائے گی، میں نے کہا، لیکن میرے پاس تو کراچی میں رہنے کو جگہ نہیں اور نہ ہی کسی کو جانتا ہوں۔ بولے، چلو یار یہ بھی کوئی بات ہے۔ انہوں نے خود ہی کراچی کی دو ٹکٹیں منگوائیں۔ میں نے کرایہ دینا چاہا تو بولے: مجھے پتہ ہے تمہیں ڈان سے ابھی چھ سو روپے ماہانہ ملتے ہیں جو بہت کم ہیں۔ جب آجائیں گے تو لے لوں گا۔ ملتان سے ٹرین پکڑی اور اگلے دن کراچی اپنے عزیز پروفیسر توصیف احمد خان کے گھر لے گئے۔ اپنی بہن کو بتایا کہ رؤف نے یہیں رہنا ہے۔ مجھے ایک علیحدہ کمرہ دے دیا گیا اور میں کئی دن ان کے ساتھ ان کی بہن کے گھر رہا۔ توصیف احمد خان جو کراچی یونیورسٹی میں جرنلزم کے پروفیسر تھے، نے میرے لیے ایک بندہ ڈھونڈا جو مجھے کراچی کے ان علاقوں میں لے گیا جہاں ہندوؤں کے گھروں کو جلایا گیا تھا۔ میری رپورٹ مکمل ہوئی تو میں نے کہا واپس ملتان چلیں۔ ہنس پڑے اور کہا بھائی اب اکیلے ہی جانا ہوگا۔ اب میں کچھ دن بہن کے گھر ٹھہروں گا۔ میں نے رپورٹ لکھنی تھی، اس لیے ملتان لوٹ گیا۔

کراچی کا یہ سفر ہم دونوں کو مزید قریب لے آیا اور اب تقریباً روزانہ ان کے دفتر میں ملاقاتیں ہونے لگیں۔ میں نے پہلی دفعہ محسوس کیا کہ اپنے جیسے کمزور انسانوں کے ساتھ کھڑا ہونا کتنا بڑا کام تھا۔

مجھے اب بھی یقین ہے جب راشد رحمٰن کو قتل کرنے کے لیے قاتل اس کے چیمبر میں گھسے ہوں گے تو وہ ہرگز نہیں گھبرائے ہوں گے۔ ہوسکتا ہے قاتل کی انگلیاں ایک بہادر اور انسان دوست راشد رحمٰن کو مارتے ہوئے کانپ گئی ہوں لیکن راشد رحمٰن ہرگز نہیں ڈرا ہوگا۔

مرنا سب نے ہے۔ اس نے بھی مرنا ہے جس نے راشد رحمٰن کو قتل کیا ہے لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہوں گے جو دوسروں کے لیے مرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں اور اپنے بچوں کو یتیم کر جائیں۔ راشد رحمٰن اپنے نظریات اور انسان دوستی کے نام پر قتل ہوا... وہ دوسروں کے لیے جیا اور دوسروں کے لیے ہی مرا۔ راشد رحمٰن کا نام میری اس فہرست میں تھا جس میں، میں نے A few good men کے نام لکھ چھوڑے ہیں۔

پتہ نہیں کیوں، مجھے ایسا لگتا ہے قاتل کو اپنے اوپر گولیاں برساتے دیکھ کر انسان دوست راشد رحمٰن یقیناً مسکرایا ہوگا اور بہتے سرخ لہو کو دیکھ کر اپنے سفاک قاتل سے بھی اسے ہمدردی محسوس ہوئی ہوگی۔ اگر اس کا قاتل پکڑا بھی جاتا اور ملتان میں راشد رحمٰن کو قتل کرنے کے جرم کا دفاع کرنے کے لیے اسے کوئی وکیل نہ ملتا اور راشد رحمٰن کا اپنی قبر میں سے بھی بس چلتا تو وہ اپنے اس قاتل کا خود ہی وکیل بن جاتا...

جی ہاں میری ''A few good men'' کی اس فہرست کا راشد رحمٰن نام کا کردار اسی طرح کا ایک انسان ہی تھا!

وبا پر یقین نہ کرنے کے بارے میں

وجاہت مسعود

اس سے پہلے کہ کراچی یونیورسٹی کے کسی زبدۃ العلما طالب علم کے سفال تحقیق میں طوفان اٹھے، مسافر اقرار کرتا ہے کہ یہ عنوان آرتھر کوئسلر کے مضمون

On Disbelieving The Atrocities

سے اخذ کیا ہے۔ آرتھر کوئسلر کو عام طور سے ناول نگار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ظلمتِ نیم روز (Darkness at Noon) ان کا شہرہ آفاق ناول ہے۔ 1904 میں پیدا ہونیوالے اس آسٹرین دانشور دانشو کا اصل میدان فلسفہ سائنس اور سیاسی سماجیات تھے۔ 1940 کے لگ بھگ ہٹلر کے نازی عقوبت خانوں کی دہشت ناک خبریں پھیلنے لگیں۔ امریکہ سمیت اتحادی ممالک میں اہلِ دانش کی اکثریت نے ہولوکاسٹ کی تفصیلات کو جنگی پروپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ آرتھر کوئسلر نے تو جنوبی فرانس کے بدنامِ زمانہ کیمپ ورنے میں قید کاٹ رکھی تھی۔ اس نے ذاتی تجربے کی روشنی میں لکھا کہ ظلم، ناانصافی، تشدد اور آفت ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو انسان ذاتی دفاع کے اضطراب میں حقیقت سے انکار پر مائل ہو جاتے ہیں، کمرے میں موجود ہاتھی سے انکار کرتے ہوئے دروازے کے نقش و نگار کی تحسین میں پناہ لیتے ہیں۔ سوویت یونین میں اشتراکی تجربے کے نقطہ عروج پر منحرف روسی دانشور ریاستی جبر پر تنقید کرنے سے پہلے کارل مارکس اور لینن کی توصیف میں تشبیب لکھنا نہیں بھولتے تھے۔ ہم عصر ایران میں استبداد پر انگلی اٹھانے والے بھی فروری 1979ء کے بنیادی حقائق کا تجزیہ نہیں کرتے۔ چین میں ثقافتی انقلاب کی پوری حقیقت بیان کرنے کیلئے ملک بدر ہونا پڑتا ہے۔ عبداللہ حسین نے لکھا، 'یہ منزلوں کا کوچ ہے جو فراموشی کی طرف رواں ہے، یاد کی رحم دلی ہے کہ منزل منزل پر ہمارا ساتھ چھوڑتی رہتی ہے'۔ مسافر کہتا ہے کہ نہیں، انسان کی تخلیقی کاوش تین نقطوں سے عبارت ہے، ظلم کی یادداشت، موجود کا جشن اور فردا کا خواب۔

خود اپنے ہاں دیکھیے۔ المیہ مشرقی پاکستان کے بعد ریاست نے عوام کے خلاف دو بڑے جرائم کیے۔ مذہبی انتہا پسندی کی آبیاری کی اور کراچی میں لسانی سیاست کا پودا لگایا۔ گزشتہ چالیس برس میں دنیا کے کسی ملک نے، کولمبیا کے استثنا کے ساتھ، زمانہ امن میں اتنی جانیں قربان نہیں کیں جتنی قیمت اہل پاکستان کو ادا کرنا پڑی۔ ہم ایسے گانٹھ کے پورے ہیں کہ 15 جون 2014 کی صبح ہم نے دہشت گردی کے خلاف کارروائی شروع کی اور سہ پہر تک کم از کم سرکاری اعلامیے میں اس کا نام ونشان مٹا ڈالا۔ یہاں آئے روز وزیرستان میں ہمارے بیٹے نامعلوم کو شہید کر رہا ہے۔ تیس برس تک کراچی میں خون کی ہولی نے عروس البلاد کی ایک نسل مٹا ڈالی، تہذیب تباہ کر دی۔ 21 اگست 2016ء کی رات تک ہمیں منزل نہیں، رہنما چاہیے تھا۔ 22 اگست کی صبح نمودار ہوئی تو کراچی کی دیواروں سے دیو کا سایہ غائب ہو چکا تھا۔ افلاک کے پردے پر خالد مقبول صدیقی نمودار ہو چکے تھے۔ کسی کو تابِ سوال نہیں کہ حکیم سعید اور محمد صلاح الدین کے لہو سے زمین رنگین ہو رہی تھی تو محترم عمران اسماعیل اور فیصل واوڈا کہاں ہوتے تھے۔ شام نگر والی کٹیا میں اظہر جعفری اور مسافر مگوچیوں کے سالن اور گرم چپاتیوں سے انصاف کر رہے تھے۔ اچانک جعفری مرحوم نے عجیب تیقن کے لہجے میں کہا، اسامہ بن لادن کا کوئی وجود نہیں۔ میرا لقمہ کٹوری اور ہونٹوں کے درمیان معلق ہو گیا۔ بن لادن کو میں نے واقعی نہیں دیکھا، باجوڑ سے کچلاک اور کراچی سے لاہور تک قبرستان آباد ہوتے دیکھے ہیں۔ میں نے تو خیر کورونا وائرس بھی نہیں دیکھا۔ صرف یہ معلوم ہے کہ دنیا بھر میں دو لاکھ چوراسی ہزار تابوت اٹھ چکے۔ سینکڑوں اموات وطنِ عزیز میں ہو چکیں۔ ان بینام صورتوں کا شمار نہیں جو اعلان کیے بغیر خاموش بستیوں کے مکین ہو گئے۔ ہم نے نومئی کو لاک ڈاؤن کے معمے میں ایک گرہ بڑھا دی ہے، بازاروں میں کھوے سے کھوا چھل رہا ہے۔ ناصر نے کہا تھا، شہر لاہور تری رونقیں دائم آباد۔۔۔ لیکن مجھے تو علی افتخار جعفری یاد آ رہے ہیں... گریہ کرتا ہوں کہ ویران ہوئے جاتے ہیں شہرمحوازاررسائی کوئی سنتا ہی نہیں۔

(Darkness at Noon) ان کا شہرہ آفاق ناول ہے۔ **1904** میں پیدا ہونیوالے اس آسٹرین دانشور دانشو کا اصل میدان فلسفہ سائنس اور سیاسی سماجیات تھے۔ **1940** کے لگ بھگ ہٹلر کے نازی عقوبت خانوں کی دہشت ناک خبریں پھیلنے لگیں۔ امریکہ سمیت اتحادی ممالک میں اہلِ دانش کی اکثریت نے ہولوکاسٹ کی تفصیلات کو جنگی پروپیگنڈہ قرار دے کر مسترد کر دیا۔ آرتھر کوئسلر نے تو جنوبی فرانس کے بدنامِ زمانہ کیمپ ورنے میں قید کاٹ رکھی تھی۔

جمہوریت ریاست اور شہری کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم کرتی ہے۔ آمریت عوام سے اخفا اور خوف کا تعلق رکھتی ہے۔ ایبٹ آباد کمیشن کے روبرو ایک بڑے صاحب نے فرمایا کہ جنہیں خوف ہے، انہیں خوف آنا چاہیے۔ موصوف مارچ 2012 کے بعد پاکستان میں نظر نہیں آئے۔ خدا جانے انہیں کاہے کا خوف ہے، ان کے خلاف تو کوئی مقدمہ بھی نہیں۔ جمہوری ثقافت کی غیر موجودگی میں ایک مخصوص اجتماعی ذہن مرتب ہوتا ہے۔ چند اشارے دیکھیے۔ فرد اور اجتماع میں نرگسیت جنم لیتی ہے۔ کائنات کا مرکزہ ہماری قوم ہے اور قوم بھی کیا ہے، دراصل تو ہماری ذاتِ اقدس نے آسمان کندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ ہمارے کیسے میں دھیلا نہیں، ناکردہ کاری ہماری لوح پر لکھی ہے مگر کس کے منہ میں دانت ہیں کہ ہمارا نام پوچھے۔ دوسرا یہ کہ ساری دنیا ہماری دشمن ہے۔ ہم ایسے منتخب روزگار ہیں کہ دن رات ہمارے خلاف سازشیں ہوا کرتی ہیں۔ تیسرا یہ کہ انکارِ حقیقت میں ہمارا ثانی نہیں۔ غلام اسحاق مرحوم کے بطخ کے بارے میں قول کو بہت شہرت ملی، فرمایا، میں نے کہہ دیا کہ بطخ نہیں تو بطخ نہیں ہے۔ افسوس کہ دنیا ایسے دعوے نہیں مانتی۔ ہماری دشمن جو ٹھہری۔ چوتھا یہ کہ ہم انصاف، حقوق، جمہوریت اور آزادی کے من مانے معنی متعین کریں گے۔ جسے ماننا ہے مانے، جسے نہیں ماننا، جہنم میں جائے۔ پانچواں یہ کہ ہم کرہ ارض پر آنکھ کی پتلی ہیں، دنیا کا فرض ہے کہ ہمارے منہ میں نوالہ ڈالے۔ ہمہ وقت کشکول اٹھائے کھڑے ہیں۔ نائن الیون ہوا تو سیاہ چشمہ صحافی نے لکھا، ڈھنگ سے سودا کیا جائے تو بہت امداد مل سکتی ہے۔ کورونا کی وبا آئی تو شیخ رشید نے یہی کہا۔ تاریخ خود کو دہرائے یا نہیں دہرائے، المیہ خود کو دہرائے جاتا ہے۔ آخری بات یہ کہ خوف کے پتھر تلے دبے ہوئے اجرامِ خاکی علت اور معلول کا تعلق سمجھنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ تدبیر کی عرق ریزی میں کون پڑے، ہمارے لیے رقت کی دولت بہت ہے۔ بہت گڑگڑاتے ہیں لیکن معیشت کی ناؤ موجِ صبا کے جھونکے سے لرزاں ہوئی جاتی ہے۔ اب صوبوں کے سامنے دست سوال دراز کیا ہے، دیکھیے، پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض...

(بشکریہ جنگ اردو)

نرسوں کا عالمی دن: کورونا کے خلاف جنگ میں فرنٹ لائن پر لڑنے والوں کو سلام

نرسز کے عالمی دن کے موقع پر اگرچہ پاکستان میں کورونا وائرس کے باعث لاک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا جشن نہیں منایا گیا اور نہ ہی عالمی دن کی مناسبت سے کوئی پروگرام منعقد کیا گیا۔

تاہم اس کے باوجود پاکستانی شہری اس وقت نرسز کے کام کو سراہتے دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ کورونا وائرس کی وبا کے خلاف جنگ میں وہ سب سے آگے ہیں۔

پاکستان میں کئی خواتین نرسز جن میں کورونا وائرس کی تشخیص ہوئی، وہ قرنطینہ منتقل ہوئیں اور بعدازاں صحتیاب ہوتے ہی اپنے کام پر واپس آ گئیں اور مریضوں کا خیال رکھنے میں مصروف ہوگئیں۔

ایسی بہادر نرسز میں پاکستان کے جنوبی صوبہ سندھ کے دارالحکومت کراچی میں قائم سول ہسپتال کے نیورولوجی وارڈ میں خدمات سرانجام دینے والی 35 سالہ صابرہ پروین بھی ہیں جنہوں نے کورونا سے صحت یابی کے فوری بعد اپنی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

صابرہ پروین میں اپریل میں کورونا کی تشخیص ہوئی تھی اور وہ دوران علاج 2 ہفتوں کے لیے قرنطینہ بھی ہوگئی تھیں مگر صحت یاب ہونے کے 2 دن بعد ہی وہ حفاظتی لباس، فیس ماسک اور دستانے پہن کر اپنی ڈیوٹی ادا کرنے ہسپتال پہنچیں۔ وہ ہاتھوں میں میڈیکل ہسٹری کا چارٹ تھامے، بلڈ پریشر مشین کو ایک بستر سے دوسرے بستر لے کر، مریضوں کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس چارٹ میں کچھ درج کرتی رہتی ہیں۔

ان کے اس مصروف شیڈول کو دیکھ کر یہ محسوس ہی نہیں ہو رہا کہ وہ حال ہی میں کورونا وائرس سے صحت یاب ہو کر واپس ڈیوٹی پر آئی ہیں۔ اپریل کے دوسرے ہفتے میں کورونا کی تشخیص کے بعد انہوں نے خود کو اپنے گھر میں قرنطینہ کر لیا تھا۔

صحت یابی کے بعد ڈیوٹی پر واپس آنے کے بعد ترک خبر رساں ادارے اناطولو سے بات کرتے ہوئے تین بچوں کی ماں صابرہ پروین کا کہنا تھا کہ 'وہ ایک برا خواب تھا، مگر اب وہ سوچتی رہتی تھیں کہ اگر ان کا کورونا کا ٹیسٹ دوبارہ بھی مثبت آیا تو ان کے بچوں کا کیا ہوگا؟'

قرنطینہ کے دوران انہوں نے اپنی بہن سے گزارش کی تھی کہ وہ ان کے بچوں کا خیال رکھیں کیوں کہ ان کے شوہر شہر میں موجود نہیں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے گھر میں 14 دنوں کے لیے بالکل اکیلی تھیں، ان کے بھائی ان کے لیے کھانا لاتے اور ان کے دروازے پر چھوڑ کر چلے جاتے، وہ اپنے بھائی کو دیکھ بھی نہیں پاتی تھیں'۔

سخت احتیاطی تدابیر کے ساتھ ہی چند دن میں ہی صابرہ پروین اس وائرس سے صحتیاب ہوگئیں اور انہوں نے واپس ڈیوٹی جوائن کر کے مریضوں کا خیال رکھنا شروع کر دیا۔

ان کی طرح 34 سالہ میل نرس امیر اللہ بھی ہسپتال میں ڈیوٹی کے دوران کورونا وائرس کا شکار ہوگئے تھے جو صحتیاب ہونے کے فوری بعد گزشتہ ہفتے واپس ڈیوٹی پر آ گئے۔

دو بچوں کے والد امیر اللہ اسپیشل وارڈ میں کورونا وائرس کے مریضوں کا خیال رکھ رہے تھے کہ 30 مارچ کو ان میں کورونا وائرس کی تشخیص ہوئی اور انہوں نے خود کو ایک ماہ تک اپنے زیر تعمیر گھر میں قرنطینہ کر لیا تھا۔

امیر اللہ نے اناطولو کو بتایا کہ 'ان کی فیملی ان کے بھائی کے گھر منتقل ہوگئی تھی کیوں کہ ان کا گھر زیر تعمیر ہے، اور بعد ازاں وہی گھر ان کے لیے قرنطینہ سینٹر بن گیا'۔

کورونا کے خلاف جنگ میں نرسز کو خطرہ

عالمی ادارہ صحت (ڈبلیو ایچ او) نے پہلے ہی سال 2020 کو نرسز اور مڈوائف کا سال قرار دے دیا ہے، کیوں کہ رواں برس جدید نرسنگ کی بانی فلورنس نائٹ انگیل کی 200 ویں سالگرہ منائی جارہی ہے۔

ہزاروں کی تعداد میں نرسز کورونا وائرس کے خلاف جنگ میں ہراول دستے کے طور پر موجود ہیں اور عالمی سطح پر ہزاروں نرسز اس وبا کا شکار بن چکے ہیں۔

کورونا سے پاکستان میں بھی بہت بڑی تعداد میں نرسز اور دیگر طبی رضا کار متاثر ہوئے ہیں جب کہ 12 مئی کی سہ پہر تک پاکستان میں کورونا سے متاثرہ افراد کی تعداد 32 ہزار 674 تک جا پہنچی تھی جب کہ اموات کی تعداد بھی بڑھ کر 724 تک جا پہنچی تھی۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 440 سے زائد طبی عملے کے کارکنان 12 مئی کی صبح تک اس وائرس سے متاثر ہو چکے تھے جن میں 70 نرسز بھی شامل ہیں اور متاثرین میں سے 8 اپنی جان کی بازی بھی ہار چکے تھے۔

طبی عملے میں وائرس کے بڑھتے کیسز کے بعد میڈیکل کمیونٹی نے طبی حفاظتی سامان کی عدم دستیابی اور حکومت کی جانب سے لاک ڈاؤن میں نرمی کے فیصلے پر احتجاج بھی کیے۔

حفاظتی لباس نہ ملنے اور لاک ڈاؤن میں نرمی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے صابرہ پروین کا کہنا تھا کہ 'شروعات میں وہ بہت خوفزدہ تھیں، صرف اپنے لیے ہی نہیں بلکہ اپنے بچوں کی بھی انہیں فکر تھی لیکن ان کا حوصلہ اس وقت بڑھا جب ان کی طبیعت بہتر ہوئی۔

انہوں نے بتایا کہ لیکن اب وہ بالکل بھی خوفزدہ نہیں، کیوں کہ انہوں نے بدترین وقت گزار لیا، یہی وجہ ہے کہ اب وہ اپنی ڈیوٹی پر واپس موجود ہوں'۔

ان کے برعکس امیر اللہ کا کہنا تھا کہ وہ اس تجربے کے بعد اپنا اعتماد کھو چکے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ 'وہ پہلے ہی بہت کچھ دیکھ چکے ہیں، اس لیے وہ جانتے تھے کہ اس وائرس سے کیسے نمٹا جا سکتا ہے اور ساتھ ہی انہوں نے پرعزم ہو کر کہا کہ وہ دوبارہ وارڈ میں ماضی کی طرح پرجوش طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دینے کے لیے تیار ہیں۔

خیال رہے کہ پاکستان کے علاوہ دنیا بھر میں 90 ہزار سے زائد نرسز و طبی رضا کار کورونا کا شکار بن چکے ہیں۔

نرسز اور طبی رضا کاروں کی عالمی تنظیم انٹرنیشنل کونسل آف نرسز (آئی سی این) کے مطابق 6 مئی تک دنیا بھر میں 90 ہزار طبی رضا کار کورونا سے متاثر جب کہ 260 نرسز ہلاک ہو چکے تھے۔ (بشکریہ ڈان اردو)

2020 کی لاپتہ عید

عاصمہ شیرازی

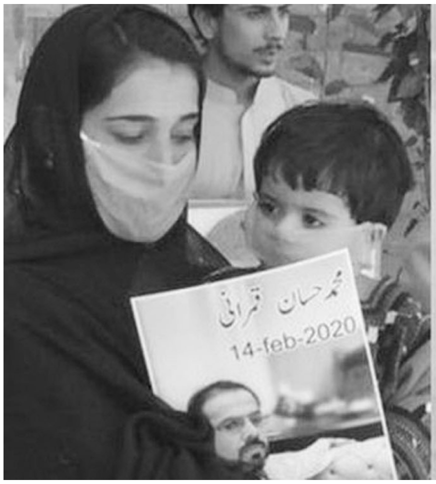

غم کیا ہے، کسی غمزدہ آنکھ سے پوچھیے ۔موت کے رقص میں زندگی کے معنی کیا ہیں، خوف سے پوچھیے ۔سانس سے وابستہ آس کیا ہے، اُمید سے پوچھیے ۔گذشتہ جمعے کو آس، اُمید، زندگی سب ہار گئے ۔۔۔ جیتا تو فقط خوف ۔

کورونا کے خوف کے سائے میں عید پہلے ہی کچھ خاص پر لطف نہ تھی اور پھر جہاز کے حادثے نے تو گویا تمام رنگ ہی چھین لیے ۔

عید بھی آئی تو کیسی آئی ۔عید دراصل خوشی کا وہ دن ہے جس دن اپنوں سے ملاقات ہوتی ہے، بچھڑے آ گلے ملتے ہیں، ناراض ناراضگیاں مٹا دیتے ہیں ۔ گلے شکوے بھلا کر، تلخیوں کو فراموش کر کے شیریں لہجوں سے محبتوں کی شیرینی بانٹی جاتی ہے ۔

پی آئی اے کی بدقسمت فلائٹ میں سوار 99 افراد جن میں سے 97 لقمہ اجل ہوئے جانے کیا کیا خواب لے کر جہاز پر سوار ہوئے ۔

ایک بیٹی باپ سے ملنے کے لیے آئی واپس لیکن گھر نہیں پہنچ پائی ۔کسی نے سوچا ہوگا گھر پہنچتے ہی بچوں کو گلے سے لگائیں گے، کوئی ماں سے ملنے کا منتظر اور کوئی بچوں کے ساتھ عید منانے کا خواہش مند ۔

انصار نقوی چار ماہ بعد گھر کے لئے روانہ ہوئے ۔دفتر سے جاتے ہوئے کہہ کر گئے کہ بچے منتظر ہیں، بیگم سے کہا ہے کہ افطار اکٹھے کریں گے ۔شیر دل کھو گئے، زارا عابد کئی سپنے لیے خاک میں مل گئیں ۔ یہ 97 نہیں 97 لوگوں سے جڑے سینکڑوں خوابوں کا غم ہے جو تعبیر نہ پا سکے ۔

ہمارے بھائیوں جیسے سینئر صحافی انصار نقوی کا خاندان بھی اُن کی راہ تک رہا تھا ۔غم سے نڈھال اُن کے اور اُن کے ساتھ جاں بحق ہونے والے کئی افراد کے لواحقین آج بھی ان کے منتظر ہیں ۔

عید بھی آئی تو کیسی آئی ۔عید دراصل خوشی کا وہ دن ہے جس دن اپنوں سے ملاقات ہوتی ہے، بچھڑے آ گلے ملتے ہیں، ناراض ناراضگیاں مٹا دیتے ہیں ۔ گلے شکوے بھلا کر، تلخیوں کو فراموش کر کے شیریں لہجوں سے محبتوں کی شیرینی بانٹی جاتی ہے ۔

جن کے عزیز بچھڑ گئے، اُن کے غم کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا ۔سوختہ جانوں کے نشان ڈھونڈنے والے خاک سے ہی سوال کر رہے ہیں کہ پل ہی پل میں کیا ہو گیا ۔ جہاز کے کپتان سے لے کر عملے اور پھر مسافروں اور اُن کے خاندانوں کی عید خاک میں مل گئی ۔آہیں ہیں، سسکیاں ہیں اور آنسو ۔۔۔کون کب تک مداوا کرے گا ۔

میں مٹی میں ملے لوگوں کے وجود ڈھونڈنے والوں کو دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ ان کو تو قرار آ جائے گا مگر وہ لاپتہ افراد جن کی نہ تو زندگی کی خبر ہے نہ موت کی ۔۔۔ان کے منتظر خاندان عیدیں کیسے مناتے ہوں گے؟

سُنا ہے بلوچستان کے گمشدہ لوگ کئی عیدیں پریس کلبوں کے باہر منا چکے ہیں ۔ جوان بیٹوں، جوان بھائیوں اور شوہروں کے ناموں کے کتبے اٹھائے یہ لوگ ایک عید کے منتظر ہیں، ایک دید کے منتظر ہیں ۔

وائس فار بلوچ مِسنگ پرسنز گزشتہ کئی سالوں سے دونوں عیدوں پر احتجاجی کیمپ آباد کرتا ہے ۔ اپنوں کی بازیابی کے لئے احتجاج کیا جاتا ہے اور احساس دلانے کی کوشش کہ عید کے دن اگر آپ کے اپنے پاس نہ ہوں تو آپ کی عید کیا ہوگی ۔

آصفہ قمبرانی اپنے ایک گمشدہ بھائی کی لاش وصول کرنے کے بعد دوسرے لاپتہ بھائی کے لئے کیمپ میں کھڑی ہے ۔ ماما قدیر بلوچ آج بھی سراپا احتجاج ہیں ۔ آمنہ مسعود جنجوعہ کے زخموں پر آج بھی کسی نے مرہم نہیں رکھا ۔ انسانی حقوق کے سرگرم رکن ادریس خٹک کی بیٹی طالیہ کی اپنے والد کی بازیابی کی اپیل پر شاید ہی کوئی پتھر دل نہ پسیجا ہو ۔

وائس آف بلوچ مِسنگ پرسنز کی رپورٹس ہزاروں کے اعداد و شمار دیتی ہیں، جنہیں غلط بھی مان لیا جائے تو سینکڑوں لاپتہ افراد سے وابستہ لواحقین کے گھروں میں عید کے دن خاموش لبوں پر حرف دعا کیا ہوتا ہوگا؟

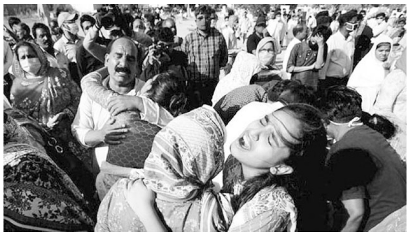

مقتدرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ خدانخواستہ ایک دن کے لئے اُن کا رابطہ اپنے بچوں اور گھر والوں سے منقطع ہو جائے اور ان کے پیارے کھو جائیں تو ان پر کیا گزرے گی؟ خدا نہ کرے کہ آپ کو اپنوں کا غم ملے، خدا نہ کرے کہ آپ کے بچے، بھائی، اہل خانہ آپ کی آنکھوں سے دور ہوں ۔۔۔

زندہ معاشروں میں زندوں کو دفن نہیں کیا جاتا ۔ریاستیں مردہ لاشوں پر قائم نہیں رہتیں قبرستان بن جاتی ہیں ۔ریاست ماں ہے تو اس عید پر وعدہ کرے کہ لاپتہ اگر مجرم ہیں تو اُنہیں کٹہرے میں لا کھڑا کیا جائے اور اگر نہیں تو اُنہیں زندوں میں شمار کیا جائے ۔

فیصلہ کرنے میں دیر نہ کریں کیونکہ ریاست کی لاپتہ عید دھرتی زادوں کی دید میں ہی ہے ۔

(بشکریہ بی بی سی اردو)

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

زمان خان

ساتھی راشد رحمان کے قتل کے بارے میں مختلف دانشور مختلف نقطہ نظر اور مختلف پہلوں سے لکھ رہے ہیں اور لکھتے رہیں گے۔ کچھ ذاتی تعلق کے حوالے سے لکھ رہے ہیں، کچھ سماجی اور ثقافتی حوالے سے، کچھ سیاسی حوالے سے، کچھ قانون اور کچھ انسانی حقوق کے حوالے سے لکھ رہے ہیں۔ ہر ایک کا اپنا اپنا نقطہ نظر ہے اور ہر ایک کو اس سانحہ پر اپنے اپنے حوالے سے لکھنے کا مکمل حق ہے۔

میں کیونکہ اس سارے تجربہ سے خود گزرا ہوں اس لئے میرا بھی ایک نقطہ نظر ہے اور میں اس سارے واقعہ اور سانحہ کو اپنے نقطہ نظر سے دیکھنے اور سمجھنے کو کوشش کروں گا۔

جب میں نے راشد کے قتل کے بارے میں سنا تو میری آنکھوں کے سامنے ساتھی نعمت احمر کی تصویر گھوم گئی جسے دن دیہاڑے لائکپور (فیصل آباد) کے ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ میں لوگوں کی موجودگی میں نہ صرف قتل کیا گیا بلکہ اس کی لاش کے ٹکڑے بھی کیئے گئے۔ پھر مجھے پنجاب کے گورنر سلمان تاثیر کا قتل یاد آ گیا جس کو اس کے اپنے ہی گارڈ نے قتل کر دیا تھا۔

ساتھی راشد رحمان کا قتل یقیناً نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا کی انسانی حقوق کی تحریک کے لئے ایک نا قابل تلافی نقصان ہے۔ اس کی کئی وجوحات ہیں مگر سب سے بنیادی وجہ یہ ہے کہ راشد رحمان کا شمار ان چند لوگوں میں ہوتا تھا جو دنیا بھر میں انسانوں کو ان کے حقوق دلوانے کی جدوجہد کے ہراول دستہ میں شامل تھے۔ جنہیں donors آجکل محافظین کہتے ہیں ۔

راشد رحمان اصل میں ان نظریات اور قبیلہ کا تسلسل تھا جو نسلوں سے افتادگان خاک کے حقوق کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور ان میں سے کئی لوگوں نے نہ صرف قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ ان کو اپنے آدرش کے لئے جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑے۔ اکثریت کا تعلق گمنام سپاہیوں سے ہے۔ راشد کا تعلق بھی عشق بلاخیز کے قافلہ سخت جان سے تھا لہٰذا اس کا انجام بھی اپنے اکابرین سے مختلف نہیں ہونا تھا۔

حقوق کے لئے جدوجہد کی تاریخ تو صدیوں پر محیط ہے اور اسے بیان کرنے کے لیے سینکڑوں کتابیں درکار ہیں اس لیے بہتر ہوگا کہ برصغیر اور صرف پاکستان کی بات کی جائے۔

انگریزوں سے برصغیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے راج کے سب سے بڑے دشمن اور غدار ٹھہرے اور ان کا مقام دارورسن تھا۔

راشد رحمان کا تعلق کیونکہ ایک ایسے گھرانے سے تھا جنہوں نے ہمیشہ عوامی سیاست کی لہٰذا راشد نے جب ہوش سنبھالا تو ان کا سامنا ایسی روایات سے تھا جن میں پسے ہوئے اور مظلوم طبقات کے حق کے لیے جدوجہد کرنا بنیادی جزو ایمان تھا۔

انسانوں کی مختلف ممالک، نسلوں، ذاتوں اور طبقوں میں تقسیم ماضی قریب کی بات ہے اور اس کا تعلق انسانوں کو ان کے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھنے کے عمل کے ساتھ ہے۔

ریاست کے بارے میں مختلف سیاسی فلسفی مختلف توجیحات پیش کرتے ہیں مگر مجھے آج بھی ریاست کے بارے میں مارکسی نقطہ نظر حقیقت کے قریب نظر آتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج کی ریاست صرف ان لوگوں کے مفادات اور زندگی کی حفاظت کرتی ہے جو ملک کے وسائل پر قابض ہیں۔ اگر مزدور اپنے حقوق کا مطالبہ کرتے ہیں تو پولیس ان کو دبانے کے لیے گولی چلانے اور ان کا قتل عام کرنے سے بھی نہیں گھبراتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں ہمارے گاؤں اور دیہاتوں میں ایک طرح کی غلامی موجود ہے۔ جہاں نہ صرف کسان ان کا غلام ہوتا ہے بلکہ اس کا سارا خاندان آقا کی ہر طرح سے خدمت کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

راشد رحمان کا تعلق کیونکہ ایک ایسے گھرانے سے تھا جنہوں نے ہمیشہ عوامی سیاست کی لہٰذا راشد نے جب ہوش سنبھالا تو اس کا سامنا ایسی روایات سے تھا جن میں پسے ہوئے اور مظلوم طبقات کے حق کے لیے جدوجہد کرنا بنیادی جزو ایمان تھا۔

راشد رحمان نے جب قانون کا امتحان پاس کیا تو اس زمانے میں کمیشن جبری مشقت (بھٹہ مزدوروں) کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا۔ لہٰذا راشد نے بھی اسی کام کو آگے بڑھایا۔ یہ اس زمانے کا سب سے مشکل کام تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ زیادہ تر بھٹہ مالکان ممبران اسمبلی کے تھے، اور وہ بھٹہ پر کام کرنے والوں کو غلاموں کی طرح برتاؤ کرتے تھے پھر پولیس اور انتظامیہ کا رویہ بھی یا آپ سوچ سمجھ لیں کہ یہی کہ بھٹہ مزدور اسی غیر انسانی برتاؤ کے مستحق ہیں۔ پھر اس نے بچوں، مذہبی اقلیتوں اور خواتین کے حقوق کے لیے بھی انتھک جدوجہد کی۔

ایک زمانہ تھا کہ ہمارا سرمایہ دار اپنی فیکٹری میں یونین بنانے کو سب سے بڑا عذاب سمجھتا تھا اور اس کے راستہ میں ہر طرح کی رکاوٹ ڈالتا تھا اس نے مزدوروں کو ڈرانے دھمکانے کے لئے غنڈے بھی پال رکھے تھے جنہوں نے کئی مزدور رہنماؤں کو ہماری زندگی میں قتل بھی کیا پھر پولیس ہر وقت مزدوروں کو دبانے کے لئے تیار رہتی تھی اور مزدوروں کے خلاف گولی چلانے سے بھی نہیں ہچکچاتی تھی۔

عوام دشمن اور مذہبی انتہا پسندوں کے پاس دلیل نہیں ہے اس لیے وہ تشدد کا راستہ اپناتے ہیں۔ یہ

بزدلی اور کمینگی کا راستہ ہے۔مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ظالموں اور عوام دشمن عناصر نے ہمیشہ اس راستہ کو اپنایا ہے اور اس طرح سے عوام پر اپنا نظریہ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔مگر تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اس میں ناکام رہے ہیں۔

چند سال پہلے جب پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ کے گورنر سلمان تاثیر کو شہید کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ حکومت وقت کی موقع پرستی اور خوف کی وجہ سے ان کا جنازہ گورنر ہاؤس میں پڑھایا گیا اور اس میں گنتی کے بہادر لوگ شامل ہوئے تھے مگر میں سلام پیش کرتا ہوں ملتان کے لوگوں کو کہ ان کی بہت بڑی تعداد نے راشد رحمان کے جنازہ میں شرکت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مذہبی جنونیوں، انتہا پسندوں کے خلاف ہیں اور وہ راشد رحمان کے مشن کے ساتھ ہیں۔میری نظر میں آج کے پاکستان میں یہ انسان دوستی کی سب سے بڑی فتح ہے اور یہ حقوق کی جنگ میں ایک سنگ میل ثابت ہوگی۔

لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ آج بدقسمتی سے پاکستان کی ریاست میں عدلیہ، انتظامیہ اور عوام کا ایک مخصوص طبقہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اگر کسی پر 'توہین رسالت' کا الزام لگتا ہے تو قانونی بھول بھلیوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔الزام سچا ہے یا جھوٹا، انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اسے قتل کرنا عین اسلام ہے اور جو کوئی ایسے شخص کو حصول انصاف میں مدد فراہم کرتا ہے یعنی اس کا وکیل بننے کی جسارت کرے وہ بھی قابل گردن زدنی ہے۔

راشد کا قصور یہ تھا کہ وہ پاکستان کے قانون اور دستور کے مطابق انصاف کے سارے تقاضے پورے کرنا چاہتا تھا جسے انگریزی میں کہتے ہیں fair trail۔یعنی ہر ایک کو انصاف ملنا چاہیے اور one is innocent unless prove quilty۔

وہ تو ریاست کی طرف سے جبری طور پر گمشدہ لوگوں (بشمول مذہبی انتہا پسند) کے لئے بھی انصاف مانگتا تھا۔اس سے پہلے مرکزی وزیر شیریں رحمان پر توہین رسالت کا الزام لگا تھا تو راشد ہی نے اس کی وکالت کی تھی۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جیل میں جب جج صاحب کے سامنے وکیلوں نے راشد رحمان کو دھمکی دی کہ وہ ملزم کے کیس کی پیروی کرنے سے دستبردار ہوجائے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ مخالف وکلا اپنے ساتھ غیر متعلقہ لوگوں کو بھی اپنے ساتھ جیل میں لے جانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔تب جج صاحب نے اس پر کیا کیا۔

کیا عزت ماب چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ جج صاحب سے یہ پوچھنا مناسب سمجھیں گے کہ انہوں نے راشد رحمان کی شکائت پر کیا ایکشن لیا......یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ قانون اندھا ہوتا ہے۔اب یہ سوال بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ جب خادم اعلیٰ پنجاب چیف منسٹر میاں محمد شہباز شریف کے علم میں یہ بات آئی کہ راشد رحمان کی جان کو خطرہ ہے تو اسے تحفظ فراہم کرنے کے لئے انہوں نے کیا احکامات فرمائے اور پولیس نے ان پر کیا عمل کیا۔

چند سال پہلے جب پاکستان کے سب سے بڑے صوبہ کے گورنر سلمان تاثیر کو شہید کیا گیا تو ہم نے دیکھا کہ حکومت وقت کی موقع پرستی اور خوف کی وجہ سے ان کا جنازہ گورنر ہاؤس میں پڑھایا گیا اور اس میں گنتی کے بہادر لوگ شامل ہوئے تھے مگر میں سلام پیش کرتا ہوں ملتان کے لوگوں کو کہ ان کی بہت بڑی تعداد نے راشد رحمان کے جنازہ میں شرکت کر کے یہ ثابت کر دیا کہ وہ مذہبی جنونیوں، انتہا پسندوں کے خلاف ہیں اور وہ راشد رحمان کے مشن کے ساتھ ہیں۔

مجھے اپنے ذاتی تجربہ سے پتہ ہے کہ پولیس اور انتظامیہ ایسے معاملات میں اگر مذہبی انتہا پسندوں کو کھلی امداد فراہم نہیں کرتی تو جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

راشد رحمان کا کیا قصور تھا؟ اس کا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ وہ پاکستان کے عوام کو ان کے حقوق دلوانے کے لیے دن رات جدوجہد کرتا تھا اور اس سلسلے میں کسی بھی قسم کے خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔راشد ایک ایسے علاقے میں کام کرتا تھا جو جاگیرداری کا گڑھ ہے۔ جہاں انسان کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔مجھے یاد ہے کہ کچھ عرصہ پہلے جب راشد رحمان کو سپریم کورٹ کا لائسنس ملا تو وہ بہت خوش تھا اور ساتھیوں کے لیے مٹھائی کا ایک ٹوکرا لایا۔راشد رحمان ایک بہت ہی ہنس مکھ، اور مرنجان شخص تھا، اس میں بہت خوبیاں تھیں۔وہ بہت اچھا فنکار تھا اس میں بہت حس مزاح تھی اسے طنز پر بھی ملکہ حاصل تھا۔

پروفیسر جنید حفیظ پر تضحیک مذہب کا الزام لگا تو اس کو کوئی وکیل نہیں مل رہا تھا۔راشد نے ان حالات میں اسے اپنی پیشہ وارانہ خدمات پیش کیں۔ یہ راستہ موجودہ حالات میں مقتل کا راستہ تھا۔ وہ اس انجام سے باخبر تھا۔وہ اپنے قتل سے چند دن پہلے لاہور آیا تو اس سے جب سینئر ساتھیوں نے دھمکی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ اس کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔مجھے بھی اس نے ہنس کر یہی جواب دیا۔سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کب تک پسماندہ اور مظلوم طبقات کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنے والے جانوں کا نذرانہ پیش کرتے جائیں گے!اس بارے میں دو نقطۂ نظر پائے جاتے ہیں۔ایک یہ کہ پرامن جدوجہد کی جائے اور تشدد کے جواب میں عدم تشدد کے فلسفہ پر عمل کیا جائے اور اپنے عمل، کردار اور قربانیوں سے دشمن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کردیا جائے اسے اخلاقی طور پر شکست دی جائے۔دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ عوام کو ان کے حقوق کا شعور دلایا جائے، بیدار کیا جائے۔تاکہ وہ جدوجہد کے لیے منظم ہوں اور آخر ایک دن آئے کہ وہ 'دست قاتل کو جھٹک دیں۔اب عقل مند یہ کہیں گے کہ ایسے موقع پر پسپائی اختیار کرنا دانشمندی ہے۔مگر میری نظر میں بعض راستوں پر جب آپ چل پڑتے ہیں تو اس میں واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا آپ صرف آگے ہی جا سکتے ہیں خواہ اس میں آپ کی جان ہی چلی جائے۔راشد نے عزت اور وقار کا راستہ اختیار کیا اور جان کی قربانی دے کر اہل وفا کا بھرم رکھ لیا اور امر ہو گیا۔

آفریت کے ساتھ جینا سیکھیے

عامر خاکوانی

کورونا کی وبا کے حوالے سے اب ہمیں ایک بنیادی نکتے میں یکسو اور واضح ہو جانا چاہیے۔ یہ وبا پاکستان سے آسانی کے ساتھ نہیں جائے گی۔ اس پر قابو پانے کا وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اگلے چند ماہ تک یہ موذی بیماری ہمارے درمیان ہی رہے گی۔ ایسا کوئی شارٹ کٹ یا انتظامی طریقہ نہیں رہا جس سے اسے کنٹرول کیا جا سکے۔ زندگی میں معجزات رونما نہیں ہوتے، غیر معمولی معرکے برپا کرنے پڑتے ہیں۔ چین نے ایسا کر دکھایا، چند ایک اور استثنائی مثالیں بھی ہیں۔ ہمیں جو کرنا چاہیے تھا، وہ ہم نہیں کر پائے۔ جو آج کرنا چاہیے، وہ بھی نہیں کر رہے۔ ایسے میں چیزیں زیادہ خراب، پیچیدہ اور گنجلک بن جاتی ہیں۔ نتیجہ خوفناک قسم کا کنفیوژن ہے، وفاقی، صوبائی حکومتوں سے لے کر افراد تک، ہر ایک اس کا شکار ہے۔

اس کی ذمہ داری کسی خاص لیڈر یا وفاقی، صوبائی حکومت پر ڈالنے کا فائدہ نہیں۔ غلطیاں حکومت سے یقیناً ہوئیں، ابتدا میں زائرین والے معاملے کو بہتر ہینڈل کر لیا جاتا، ممکن ہے اس وقت محدود مدت کے لئے سخت لاک ڈاؤن کر لیا جاتا تو شائد یہ وبا زیادہ نہ پھیلتی۔ البتہ سخت لاک ڈاؤن اپنی جگہ جو تباہی مچاتا، وہ ایک اور المیہ کہانی بن جاتی۔ ایک ٹاک شو میں یہ سوال پوچھا گیا کہ ذمہ دار کون ہے، وفاقی یا صوبائی حکومتیں؟ میرا جواب تھا، اصل ذمہ دار پاکستانی عوام ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اگر عوام یعنی ہم لوگ ڈسپلن کا مظاہرہ کرتے، وبائی بحران کے طریقے اپناتے، میل ملاقاتیں نہ کرتے، احتیاط کے ساتھ باہر نکلتے تو یقینی بات ہے کہ یہ بحران بڑی حد تک کنٹرول ہو جاتا، کم از کم اس کا شدت والا وقت گزر چکا ہوتا۔ ایسا نہیں کہ میڈیا نے آگہی میں کسر چھوڑی ہو یا حکومت نے مہم نہیں چلائی۔ بچے بچے کو معلوم ہے کہ کورونا سے کس طرح بچنا ہے۔ اصل بات مگر معلومات پر عمل کرنا ہے، ہم اس امتحان میں بری طرح ناکام ہوئے۔

اب سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وبا پھیل چکی، جلدی جانے والی نہیں تو اب ہمیں عِفریت یا بلا کے ساتھ جینا سیکھنا ہوگا۔ اس پر کئی ماہرین سے بات کی، تجزیہ نگار دوست اور طبی ماہر ڈاکٹر عاصم اللہ بخش سے تفصیلی ڈسکس کیا۔ چند نتائج اخذ کئے۔ وہ شیئر کرتا ہوں۔

کورونا کے دو طرح کے مریض ہیں۔ کچھ لوگوں میں علامات جلد اور شدید انداز کی ظاہر ہو جاتی ہیں، تیز بخار، چھینکیں، کھانسی وغیرہ، جبکہ کچھ میں اس کا شکار ہو جانے کے بعد بھی علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ ماہرین کا مشورہ یہ ہے کہ اپنے قریب موجود ہر شخص کو کورونا کا ایسا مریض سمجھیں، جس کی علامات ظاہر نہیں ہوئیں۔ اسے خود بھی نہیں پتہ، مگر وہ لاعلمی میں بھی آپ کو کورونا کا مریض بنا سکتا ہے۔ اس لئے چند فٹ کا فاصلہ رکھتے ہوئے محتاط رہیں۔ خود کو بھی کورونا کا ایسا مریض تصور کریں، جس کی علامات ظاہر نہیں ہوئی، مگر قریب آ؟نے والے کسی بھی شخص کو یہ بیماری منتقل ہو سکتی ہے۔

ماسک کورونا سے بچاؤ کا بہت اہم ہتھیار ہے۔ ماسک اور ہاتھوں میں گلوز یا وقفے وقفے سے ہاتھ صابن سے دھونا یا سینی ٹائزر سے صاف کرنا کامیابی کی چابی ہے۔ اچھا ماسک لینے کی کوشش ضرور کریں، N95، K95 وغیرہ پہلے ناپید تھے، اب کچھ کوشش سے مل جاتے ہیں۔ یہ نہ ملیں تب بھی جو ماسک مارکیٹ میں دستیاب ہیں، انہیں استعمال کر لیں، حتیٰ کہ گھر کے بنے ہوئے کپڑے کے ماسک بھی کسی نہ کسی حد تک کفایت کر جائیں گے۔ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے۔ سینی ٹائزر عام ہیں. مختلف فارماسیوٹیکل کمپنیوں نے بنا لئے ہیں، کوشش کریں کہ گاڑی، دفتر میں اپنی میز، حتیٰ جیب میں بھی رکھیں۔ پانی اور صابن سے ہاتھ دھونے کی سہولت موجود نہیں تو وقفے وقفے سے سینی ٹائزر استعمال کرتے رہیں۔

اپنے طرز عمل میں ڈسپلن لے آئیں۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں۔ باہر نکلتے وقت ماسک اور دیگر احتیاطی تدابیر اختیار کریں۔ غیر ضروری خریداری سے گریز کریں۔ جہاں جانا ضروری ہو، وہاں رش نہ ہونے دیں۔ چند لمحے انتظار کر لیں۔ کسی دکان پر بھیڑ ہے تو اس کے چھٹنے کا انتظار کریں یا پھر کسی دوسری دکان سے کام چلا لیں۔ یہ نظم وضبط آپ کو ان شااللہ اس وبا سے محفوظ رکھے گا۔

ایک اہم نکتہ یاد رکھیں کہ ماسک، گلوز اور فاصلہ رکھنے کی احتیاط اس لئے ہے کہ اگر خدانخواستہ کسی کمزور لمحے میں آپ اس وائرس کا شکار ہو گئے، تب بھی وائرس لوڈ کم رہے۔ یہ بہت اہم بات ہے، اسے سمجھنے کی کوشش کریں۔ جب وائرس لوڈ زیادہ ہو تب حملے میں شدت زیادہ ہوگی اور جسم کے اندر تباہی بھی اسی مناسبت سے ہوگی۔ وائرس لوڈ کم ہو تو ایک طرح سے بیماری آپ کے لئے ویکسین کا کام کرتی ہے۔ آپ شکار ہو کر ٹھیک بھی ہو جاتے ہیں، مگر علامات ظاہر نہیں ہوتیں۔ ایک بار ہو گئی تو پھر آپ آئندہ کے لئے اس سے محفوظ ہو جائیں گے۔

آج کل قوت مدافعت یعنی امیونٹی Immunity بہتر بنانے کی بہت باتیں ہو رہی ہیں۔ اہم نکتہ یہ ہے کہ اصل امیونٹی آپ کا اپنا طرز زندگی بہتر کرنا اور کھانے کی بری عادتیں چھوڑنا ہے۔ یہ وہ امیونٹی ہے جو آپ کے ساتھ مستقل رہے گی۔ ڈاکٹر عاصم اللہ بخش اس کے لئے ایک دلچسپ مثال دیتے ہیں کہ ستر سی سی موٹر سائیکل پر تین افراد سوار ہیں، آپ دس دس کلو دودھ کے دو ڈبے بھی لٹکا رکھے ہیں۔ ایسے میں موٹر سائیکل کی کارکردگی بہتر بنانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اس پر بوجھ کم کیا جائے۔ انسانی جسم کی کارکردگی بہتر بنانے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ جنک فوڈ اور بے وقت کھانے کی بری عادتوں کا بوجھ اس پر سے اتارا جائے۔ نیند پوری نہ ہونے سے جسم متاثر ہوتا ہے، یہ بوجھ بھی ہٹ جائے، ورزش نہ کرنے سے اعضا مضمحل ہیں، یہ بھی ٹھیک کئے جائیں۔ وقت پر سوئیں، سات گھنٹے کی بھرپور نیند لیں۔ یاد رکھیں کہ رات دس سے بارہ بجے کے دو گھنٹے افادیت کے اعتبار سے چار گھنٹوں کی نیند کے برابر ہیں۔ رات بھر جاگنے کے بجائے دس گیارہ بجے تک ہر حال سو جائیں، نیند پوری کریں۔ کھانا وقت پر کھائیں۔ بازاری کھانے اور غیر صحت مند چیزیں کھانا چھوڑ دیں۔ سادہ، تازہ خوراک لیں، موسمی پھل، سلاد وغیرہ کھائیں اور دن میں کم از کم آدھا گھنٹہ تیز چلیں، سونے سے پہلے دس پندرہ منٹ کی چہل قدمی بھی کریں۔ اس سے آپ کی جسم کی پرفارمنس اور کارکردگی مستقل بنیادوں پر بہتر ہوگی، زندگی بھر ساتھ دے گی۔

وقتی طور پر ملٹی وٹامن کھانے میں کوئی حرج نہیں، اس کا فائدہ ہوگا۔ وٹامن سی اور زنک کھانے سے قوت مدافعت بہتر ہوتی ہے، وٹامن ڈی مفید ہے۔ اپنی شوگر کنٹرول رکھیں۔ قہوہ جات سے سانس کے مسائل کم ہوتے ہیں۔ پنڈی صدر کے حکیم شمیم احمد خان چٹکی بھر سونف، پودینہ، ادرک، دار چینی اور تین لونگ گرم پانی کے کپ میں دم کر کے چھان کر پینے کا بتاتے ہیں۔ بعض دوسرے ادرک، دار چینی کا قہوہ بتاتے ہیں۔ ایک ماہر غذائیت لہسن کے ٹکڑے کھانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ دودھ میں ہلدی، شہد اور زیتون کا تیل ایک ایک چمچ ملا کر پینے کا بھی کہا جا رہا ہے۔ سنا مکی کے قہوے کی آج کل دھوم مچی ہے، مگر بعض حکما کے خیال میں سنا مکی کو اکیلے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ حکیم نیاز ڈیال جو نیچرو پیتھی کے اچھے ماہر ہیں، ان کا کہنا ہے کہ سنا مکی بلغم کے اخراج میں معاون ہے، مگر اس کی زیادتی سے معدے کے مسائل پیدا ہوں گے۔ سنا مکی ایک گرام، ادرک کی کاشیں نصف گرام، اور چند گلاب کی پتیوں کو گرم پانی کے کپ میں ڈال کر دس پندرہ منٹ کے لئے ڈھانپ دیں، پھر چھان کر شہد مل کر پی لیں تو فوائد کثیرہ کا باعث ہے، اسی طرح سنا مکی ایک گرام، سات دانے منقیٰ اور گلاب کی چند پتیوں کے ساتھ بھی قہوہ بن سکتا ہے، سنا مکی، سونٹھ اور دیسی شکر ہم وزن ملا کر سفوف بنا لیں، رات سوتے وقت نصف چمچہ استعمال کریں تو بدن کے بادی سے متعلق تمام امراض کا ان شااللہ خاتمہ ہو جائے گا۔

مجھے ذاتی طور پر کورونا کے ابتدائی دنوں میں شدید الرجک کھانسی ہوئی، ان دنوں خوف بہت پھیلا تھا، پریشانی رہی۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ سخت کھانسی رہی۔ ہر قسم کا علاج کر کے دیکھ لیا۔ پھر ایک دوست حکیم حبیب الرحمٰن کاظمی نے دوائی بنا کر دی، اس نے کرشمہ کر دکھایا۔ عناب، لسوڑی اور بھئی سے بنائی گئی تھی۔ بلغم کا اخراج ہوا اور سانس بحال۔ کھانس کھانس کر بے حال ہو گیا تھا، تین چار دنوں میں الحمدللہ مرض کا خاتمہ ہو گیا۔ ان دیسی چیزوں، ہربل علاج کی افادیت سے انکار نہیں۔ یہ بات مگر ذہن میں رہے کہ آپ کتنے دن وٹامن سی، زنک کھائیں گے؟ کتنے دن قہوہ بنا کر پیتے رہیں گے؟ کوئی پتہ نہیں کورونا سے ہمارا آپ کا واسطہ جون میں ہوتا ہے یا اگست میں یا پھر خدانخواستہ نومبر، دسمبر یا اگلے سال مارچ میں؟ کوئی نہیں بتا سکتا کہ یہ موذی کب جائے گا؟ دوبارہ تو نہیں آ جائے گا؟ تبدیل شدہ شکل میں تو حملہ نہیں ہو جائے گا؟ اس لئے اپنے اندر صحت مند عادتیں پیدا کریں، طویل المیعاد اور دائمی تبدیلی لائیں، جو کٹھن لمحوں میں آپ کا ساتھ دے جائے۔ ہمیں اپنی تمام تر ذہانت استعمال کر کے اس عِفریت کے ساتھ جینا سیکھنا ہوگا۔ کامیابی اسی میں پوشیدہ ہے۔

(بشکریہ ڈیلی اردو کالم)

جبری مزدوری......استحصال کی بدترین شکل

تعارف

جبری مزدوری استحصال کی بدترین شکلوں میں سے ایک ہے۔اس سے غریب مزدوروں کی ایسی ملازمت مراد ہے جس میں اُنہیں برائے نام اُجرت ملتی ہے یا اجرت طے ہی نہیں کی جاتی اور اپنی بقا کے لیے آجروں پر منحصر ہونے کی بدولت' مزدور اوران کے خاندان نہ صرف جائز اجرت بلکہ نقل وحرکت کی آزادی اور روزگار کے لیے دیگر ذرائع کے انتخاب سے محروم ہوجاتے ہیں۔یہ ایک ظالمانہ نظام ہے جس کی ہر متاثر فرد کو بھاری قیمت چکانا پڑتی ہے۔اِس نظام میں مزدوروں سے غیر انسانی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ان کے خاندانوں کے ہر فرد، بالخصوص بچوں کی زندگی کی قدر گھٹ جاتی ہے، آجر قانون کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوتے ہیں اور ملکی معیشت کمزور ہوجاتی ہے۔پاکستان میں گروی مزدوری اور جبری مزدوری کو ختم کرنے کے لیے کئی کوششیں ہو چکی ہیں اور ریاست ایسے ہر رواج کے خاتمے پر کمربستہ ہے لیکن اس کے باوجود اس مسئلہ کی شدت اور پھیلاؤ میں اضافہ ہو رہا ہے۔اس کی ذمہ داری کسی حد تک گروی مزدوری کے خاتمے کے 1992 کے قانون میں 2016 میں کی جانے والی ترمیم پر ڈالی جاسکتی ہے جس کے ذریعے' پیشگی' کے نظام کو بحال کر دیا گیا ہے اور جو پیشگی رقوم کی عدم ادائیگی کی ضرورت میں عملاً مزدوروں کی غلاموں جیسی حیثیت، اُن کی فروخت اور سمگلنگ کو جواز مہیا کرتی ہے۔

قانون کے مطابق مزدوروں کے حقوق

پاکستان کے آئین کے حصہ دوم: ''بنیادی حقوق اور پالیسی کے اصولوں'' 1 میں مزدوروں کے حقوق سے متعلق کئی دفعات شامل ہیں۔

☆ آئین کی دفعہ 11 میں غلامی کی تمام صورتوں، جبری مزدوری اور بچوں سے کام لینے کی ممانعت ہے۔

☆ دفعہ 17 انجمن سازی اور انجمنوں میں شمولیت کو ایک بنیادی حق قرار دیا گیا ہے۔

☆ دفعہ 18 تمام شہریوں کو یہ حق دیتی ہے کہ وہ کوئی بھی قانونی طور پر جائز پیشہ اختیار کریں اور کوئی بھی ایسا کاروبار کرسکیں جس کی قانون میں اجازت ہے۔

☆ دفعہ 25 کے مطابق قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور محض صنف کی بنیاد پر اُن میں تفریق کی ممانعت ہے۔

☆ دفعہ 37 (ہ) میں کام کے منصفانہ اور سازگار حالات کار کے تحفظ کا حق دیا گیا ہے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جائے کہ عورتوں اور بچوں سے کوئی ایسا کام نہیں لیا جائے گا جو اُن کی عمر اور جنس کے لحاظ سے غیر موضوع ہو۔نیز ملازمت کے دوران ماں بننے والی خواتین کے حقوق متعین کیے گئے ہیں۔

تاہم' قانون بنانے اور اس کے مؤثر نفاذ کا نظام قائم کیے بغیر جبری مزدوری کے خلاف آئینی ضمانتیں عملی صورت اختیار نہیں کرسکتیں۔جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ کی منظوری اس سلسلے میں پہلا قدم تھا۔

جبری مزدوری (خاتمہ) ایکٹ

جبری مزدوری کے نظام کے خاتمے کا قانون 1992 میں پارلیمان سے منظور ہوا اور اُسی سال 17 مارچ کو نافذ العمل ہوا۔اُس دن پاکستان بھر میں جبری مزدوری کا نظام قانونی طور پر ختم ہوگیا، تمام گروی مزدور جبری مزدوری کی ذمہ داری سے آزاد اور سبکدوش ہوگئے ﴿دیکھیے قانون کی دفعہ 4(1)﴾۔

☆ ہر شخص کو جبری مزدوری کے نظام کے تحت پیشگی ادائیگی کرنے یا کسی فرد کو جبری مزدوری یا جبری مزدوری کی کوئی اور صورت اختیار کرنے پر مجبور کرنے سے منع کر دیا گیا ﴿دفعہ 4(2)﴾۔

☆ تمام رسوم و رواج، روایتی طریقے، اور تمام معاہدے یا دیگر دستاویزات، جب بھی طے پائے ہوں، جن کے تحت کسی شخص یا اُس کے خاندان کے کسی فرد پر جبری مزدوری لازمی قرار دی گئی تھی' باطل اور غیر موثر ہوگئے۔(دفعہ 5)

☆ ہر گروی مزدور کے ذمہ واجب الادا قرض واپس کرنے کا فریضہ غیر موثر ہوگیا﴿دفعہ 6(1)

☆ کسی عدالت، ٹربیونل یا دیگر ادارے کو اختیار نہ رہا کہ وہ جبری مزدوری کے ضمن میں دیے گئے کسی قرض کی وصولی کے لیے کوئی مقدمہ سنیں یا دیگر کارروائی کریں (دفعہ 6 (2)) اور اس قانون کے نفاذ سے پہلے جاری کیے گئے تمام فرامین اور احکامات جن پر عمل درآمد مکمل نہیں ہوا تھا ان کے بارے میں فرض کرلیا گیا کہ اُن پر عمل درآمد ہو چکا ہے۔(دفعہ 6 (3))

☆ گروی مزدوروں سے جبراً وصول کی گئی، فروخت کی گئی، یا رہن کی گئی یا ضبط کی گئی جائیداد اُن کو واپس دلانے کے لیے کئی اقدامات عمل میں لائے گئے۔(دفعہ 6 (4) تا(7))

☆ جبری مزدوری کے نظام کے تحت کسی بھی حیلے یا بہانے سے کسی کو کام پر مجبور کرنے والا یا کام لینے والا ہر شخص دو سے پانچ سال تک قید یا 50,000 روپے کے جرمانے یا بیک وقت دونوں سزاؤں کا سزا وار ہوسکتا ہے۔ 90 دن کے اندر اندر گروی مزدوروں سے چھینی گئی جائیداد واپس نہ کرنے پر قید یا اور جرمانہ کی سزا تجویز کی گئی۔

☆ صوبائی حکومتیں ضلعی حکومتوں کو قانون کے نفاذ کے لیے ضروری تما اختیارات اور فرائض تفویض کر سکتی ہیں۔

☆ منتخب نمائندوں اور عہدے داروں کو جبری مزدوری سے آزاد کیے گئے مزدوروں کی بہبود کے فروغ اور اُن کے معاشی مفادات کے تحفظ کی ذمہ داری دی گئی تاکہ انہیں دوبارہ گروی قرضے نہ لینے پڑیں۔

☆ ضلعی حکومتوں اور دیگر متعلقہ عہدے داروں کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کا پتہ چلائیں کہ آیا اُن کے زیرِ انتظام علاقوں میں گروی مزدوری کروائی جا رہی ہے۔گروی مزدوری کے نظام کی کوئی شہادت ملنے کی صورت میں اُن کا فرض تھا کہ اس قانون پر عمل درآمد کے لیے ضروری کارروائی کریں۔

جبری مزدوری کے انسداد کے قانون سے متعلقہ مسائل

جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ، جسے حکومتِ پنجاب نے معمولی ترامیم کے ساتھ 2012 میں اپنا لیا تھا تمام دیگر قوانین پر مقدم تھا لیکن جنوری 2016 کے صوبائی آرڈیننس نے' پیشگی' کے نظام کو بحال کر دیا۔اس کی 'حد' وقت پر مبنی اجرت کی صورت میں ایک وقت کے معاوضے کا چھ گنا اور فی تنگ ادائیگی کی صورت میں مہینے بھر کی کمائی کا چھ گنا مقرر کیا گیا۔اس اصول کی تاویل میں ابہام سے پیدا ہونے والی دِقت کو ختم کرنے کے لیے اب پیشگی کی حد 50,000 روپے مقرر کی گئی ہے۔یہ رقم ''موزوں صورتوں میں''، عدالت عظمیٰ کی طرف سے مقرر کی گئی حد سے کہیں زیادہ ہے اور مقروض شخص کو غلامی کے بندھن میں دھکیل سکتی ہے۔

جناب آئی۔اے۔رحمٰن کے مطابق نہ صرف یہ کہ اِس

رجعت پذیر دفعہ کو جبری مزدوری نظام (خاتمہ) ایکٹ میں عائد پیشگی کی ممانعت کے ساتھ ہم آہنگ کرنا بظاہر ناممکن ہے بلکہ ''قانون سازوں نے 1988 سے پہلے 1992 تک جاری رہنے والی اس تمام تر بحث کو نظر انداز کر دیا ہے کہ پیشگی رقم کو کس طرح عشروں تک ہیرا پھیری کے ذریعے مزدوروں کے ذمہ واجبات میں اضافے، اُن کی غلاموں جیسی حیثیت اور پیشگی کی ادائیگی میں ناکامی پر اُن کی فروخت کو جائز قرار دینے کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔''2

پیشگی کے نظام کی بحالی سے مزدوروں کے استحصال اور قرض کی غلامی کے مسائل ایک بار پھر سامنے آ گئے ہیں۔ ایچ آر سی پی (HRCP) نے پاکستان بھر میں محنت کشوں کے ساتھ جن 13 فوکس گروپ مباحثوں کا انعقاد کیا تھا اُن سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ آجروں کی طرف سے دی گئی پیشگی اُنہیں اپنی طاقتور حیثیت اور سیاستدانوں اور پولیس کے ساتھ سماجی تعلقات سے ناروا فائدہ اٹھاتے ہوئے مزدوروں کو پابند رکھنے اور اُن پر بے پناہ دباؤ ڈالنے کا موقع دیتی ہے۔ اسی سے متعلق ایک اور مسئلہ حساب داری میں فریب دہی کا ہے جسے قرض کی ادائیگی کا انتظام کرنے والے لوگ محنت کشوں کے ذمہ رقم کو بڑھانے اور یوں اورانہیں دیر تک پابند رکھنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

جنوری 2016 کے آرڈیننس کے علاوہ ایک بڑا مسئلہ قانون پر عملدرآمد کا ہے۔ اس ایکٹ کے تحت نگران ضلعی کمیٹیاں تو بنا دی گئی ہیں لیکن مالکان اور آجروں کی نگرانی اپنی پست ترین سطح پر ہے اور بچوں سے کام لینے، مزدوروں کو تاخیر سے یا کم اجرت دینے اور کام کے برے حالات کار جیسے رواج کا سلسلہ جاری وساری ہے۔

منصوبے کا مقصد

یہ منصوبہ ایچ آر سی پی اور فریڈرک نعمان فاؤنڈیشن فار فریڈم کے درمیان تعاون پر مبنی ایک کوشش ہے۔ اس کا مقصد ایسی سفارشات کو قلمبند کرنا ہے جن سے جبری مزدوری اور انسانوں کی اسمگلنگ کے خاتمہ میں مدد ملے اور اندرون ملک محنت کشوں کے حالات بہتر ہوسکیں۔ اس کا ایک اہم پہلوان معاملات سے متعلق رائج قوانین کا جائزہ لینا اور یہ اندازہ لگانا ہے کہ آیا اُن پر مؤثر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

طریق کار

مزدوروں کے حقوق کی موجودہ صورتِ حال کو جانچنے کے لیے ملک بھر میں سات جگہوں پر متعلقہ فریقین سے مشاورت اور 13 جگہوں پر مزدوروں کے ساتھ فوکس گروپ مباحثے منعقد کیے گئے۔

متعلقہ فریقین کے ساتھ مکالمے کا مقصد ان قوانین کی نوعیت اور دائرہ کار سے متعلق شرکاء کے فہم میں بہتری لانا تھا جو غلامی کی جدید صورتوں سے متعلق ہیں جن میں جبری مزدوری، گھریلو مشقت، بچوں سے کام لینا، انسانی اسمگلنگ اور زبردستی کی شادیاں شامل ہیں۔ پاکستان میں جبری مزدوری کی موجودہ صورتِ حال اور اُن مسائل پر بحث کروائی گئی جن سے متعلقہ محکموں کے کام میں رکاوٹ پیش آتی ہے اور اس سے سفارشات اخذ کی گئیں۔ متعلقہ فریقین کے ساتھ کی گئی مشاورتی تقاریب میں متعلقہ سرکاری محکموں کے ارکان، بالخصوص بین الاقوامی معاہدات پر عملدرآمد کے شعبے کے افراد بھی موجود تھے اور نگران ضلعی کمیٹیوں کے ارکان، وکلاء، انسانی حقوق کے کارکن، صحافی اور سماجی بہبود کے افسران بھی۔

فوکس گروپ مباحثے ہر صوبے میں مختلف اضلاع میں رکھے گئے تھے۔ ان کا مقصد مزدوروں سے بات چیت کرنا اور اُن کے موجودہ مسائل کو سمجھنا تھا۔ یہ مباحثے گلگت، حیدر آباد، میر پور خاص، کوئٹہ، تھر، اوکاڑہ، پشاور، درہ آدم خیل، کوہاٹ، کراچی، ملتان، فیصل آباد، چنیوٹ، لاہور اور میں سکھر میں ہوئے۔ ایچ آر سی پی کی ٹیم نے ہر علاقے میں ہر قسم کے مزدوروں کے مسائل کا احاطہ کرنے کے لیے اُن سے غیر رسمی اور غیر ساختہ انٹرویو بھی کیے۔

موضوع وار بیان

محکمہ محنت کے مسائل: نگرانی، عمل درآمد اور دستاویز سازی کا فقدان

مؤثر انضباطی نظام کی عدم موجودگی، نیز افرادی قوت کی صلاحیتوں سے بھرپور استفادہ کے لیے طویل المدت منصوبہ بندی میں ناکامی کے نتیجے میں مزدوروں کے استحصال میں اضافہ ہوا ہے۔ قانون کی تعمیل میں ایک رکاوٹ خواندگی کی پست سطح بھی ہے کیونکہ مزدور عام طور پر اپنے حقوق سے لاعلم اور غیر آگاہ ہونے کے باعث قانون کی خلاف ورزیوں، عدم تعمیل اور کام کی جگہ پر کم اجرتوں کی شکایت نہیں کر پاتے۔ اس کے ساتھ محکمہ محنت بھی ایسے معائنے کا اہتمام نہیں کرتا جس سے یہ پتہ چلے کہ سماجی تحفظ کے انتظامات مہیا کیے گئے ہیں یا نہیں، مؤثر طور پر روبہ عمل ہیں یا نہیں اور بچوں سے کام لینے جیسے غلط رواج جاری ہیں یا نہیں۔

ملازمتوں کے معاہدوں کا نہ ہونا

شرکا سے یہ سوال کیا گیا تو اُن کا کہنا تھا کہ بھرتی کے وقت اُنہیں رسمی، تحریری معاہدے نہیں دیے جاتے۔ وقار کا، جو گلگت بلتستان میں چیری چننے والوں میں سے ہیں، کہنا تھا کہ: 'زیادہ تر مزدور زبانی معاہدوں کی صورت میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔ اِس علاقے میں کام کرنے والے دوسرے مزدوروں کی طرح ہماری بھرتی بھی زبانی اقرار سے ہوئی تھی۔ تحریری معاہدوں کا اصول صرف سرکاری محکموں کی حد تک لاگو ہے۔ نجی اداروں میں آپ کو تحریری معاہدے کے ساتھ بھرتی نہیں کیا جاتا۔ خاص طور پر جب آپ کا کام موسمی نوعیت کا ہو'

اینٹوں کے بھٹوں پر ملازمت کے معاہدے کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ منتظمین ہی پیشگی کا حساب رکھتے ہیں اور کسی مزدور کو اس کی تفصیلات کا پوچھنے کا حق حاصل نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پیشگی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اور ہم نسل در نسل انہی حالات میں کام کرنے پر مجبور رہتے ہیں کیونکہ ہم کبھی بھی اپنے قرضے ادا نہیں کر پاتے۔'' چنیوٹ کے ایک بھٹہ مزدور نے بتایا۔ ایک ایف جی ڈی میں شریک کوئلہ نکالنے والے ایک مزدور کے مطابق اُن کے اور اُن کے آجروں کے درمیان کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں ہوتا کیونکہ ملازمت کی توثیق زبانی اقرار سے کی جاتی ہے۔ چنانچہ کمپنی مالکان کسی بھی وقت کسی بھی وجہ سے مزدوروں کو فارغ کر سکتے ہیں۔ بالعموم اس اقرار میں رہائش، کسی حادثے کی صورت میں علاج اور کان کنی کے لیے ضروری آلات وغیرہ کا ذکر ہوتا ہے۔ خوراک کا خرچ مزدور خود اٹھاتے ہیں۔ ایک کان کن رحیم خان کا کہنا تھا کہ ''کام سے نکالے جانے کی بڑی وجوہات چوری اور کاہلی ہوتی ہے۔ کسی مزدور کی وفات کی صورت میں اُس کے خاندان کو کوئی مالی معاوضہ نہیں ملتا۔ حکومت اور مالکان نے کسی کان کن کی موت کی صورت میں 500,000 روپے اور 300,000 روپے کے پیکیج کی منظوری تو دے رکھی ہے لیکن آج تک کسی کو اس کی ادائیگی نہیں ہوئی۔''

فیصل آباد کے ایک مزدور نے جو اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والوں کی یونین کے جنرل سیکرٹری ہیں، بتایا کہ وہ کسی ناانصافی کی صورت میں مالکان یا منتظمین کے خلاف عدالت میں نہیں جا سکتے کیونکہ اُن کے پاس ملازمت کا کوئی ثبوت نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ اصل میں ایک زیادہ بڑے مسئلے سے جڑا ہوا ہے جس سے جدید غلامی کی نشاندہی ہوتی ہے: تمام مزدوروں کو قومی شناختی کارڈ اور سماجی تحفظ کے کارڈ فراہم کرنے میں ناکامی۔ (اس پر تفصیلی بحث اگلے حصے میں آئے گی)

بچوں سے کام لینا اور جنسی استحصال

یہ بھی ضروری ہے کہ پاکستان میں 1999 کے بچوں سے مزدوری لینے کی بدترین صورتوں سے متعلق بین الاقوامی معاہدے کی تعمیل کی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔ اس امر کی نشاندہی ضروری ہے کہ خطرناک حالات میں بچوں سے کام

کرانے کا گھناؤنا رواج بلا روک ٹوک جاری ہے۔ بعض اوقات پیشگی مزدوروں کے لیے ایک ناقابلِ تسخیر بوجھ بن جاتی ہے۔ ایسے میں اس قرض کی ادائیگی کے لیے والدین اپنے بچوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھیج دیتے ہیں تاکہ وہ یہ رقم کما کر قرض ادا کرسکیں۔ چنیوٹ کے ایک بھٹہ مزدور بوٹا کے مطابق ''والدین مشکل حالات سے مجبور ہو کر خود ہی اُنہیں بھٹوں کے مالکان کے پاس بھیج دیتے ہیں جہاں وہ اُن کے ہاتھوں بے بس مہرے بن جاتے ہیں۔'' کھیتوں پر مزدوری کے لیے دستیاب بچوں کی تعداد میں اضافے سے زراعت سے جُڑے معاشرے میں پیداوار میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ دس سال اور بارہ سال کی عمر کے بچے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرتے ہیں۔ چنیوٹ میں وہ عمارتیں اور سڑکیں بنانے کی مزدوری میں بھی نظر آتے ہیں۔ ایک مشاورت میں شرکا نے بتایا کہ بھٹہ مالکان مزدوروں کے بچوں کو اسکول نہیں جانے دیتے کیونکہ وہ اُن کے لیے سستی مزدوری کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ ''اگر مفت دوائیں، رہائش اور مفت تعلیم مہیا ہوں تو بہت سے مدرسوں کو چھوڑ کر اسکولوں میں داخل ہو جائیں گے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ایک ہی خاندان کے دو یا تین افراد کے کام کرنے کی صورت میں ان کے پاس کافی پیسہ جمع ہو جاتا ہے لیکن وہ پھر بھی یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے کام کرتے رہیں۔ چار مزدوروں نے پیشگی چکانے کے لیے اپنے گردے بیچ دیے۔ گردوں کی فروخت کا انتظام بھی بھٹے کے مالکان نے کیا۔ صاف نظر آتا ہے کہ والدین خود غربت کے لامتناہی دائرے کے ہاتھوں اس نظام کا شکار اور مظلوم ہیں۔''

''گھروں اور چھوٹے چھوٹے کارخانوں میں کام کرنے والی عورتوں اور بچوں کے کوائف کے قلمبند نہ ہونے سے اُن کے معاشی اور جنسی استحصال کا موقع پیدا ہوتا ہے۔ استحصال کے خاتمے کے لیے متعلقہ محکموں کو چاہیے کہ ہر مزدور کے کوائف تحریر میں لانے کو یقینی بنائیں۔ اس ماحول میں نہ ہم عورتیں تعلیم حاصل کرسکتی ہیں اور نہ ہی ہمارے بچے''۔ گفتگو میں شریک اور خاتون نے کہا۔

وکیل اور تربیت کار ذوالفقار قریشی نے اس امر کی نشاندہی کی کہ بچوں سے مشقت لینے کے کئی واقعات کی خبر مقامی ذرائع ابلاغ کی بجائے بین الاقوامی ذرائع سے آتی ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ معاملے کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ مقامی اور قومی سطح پر اسے اچھی طرح اجاگر کیا جاتا رہے۔

ایچ آر سی پی کی تربیت کار محترمہ طاہرہ حبیب کے مطابق ''بعض اوقات مزدور اس پیشگی کی وجہ سے کام نہیں چھوڑ سکتے جو انھوں نے مالک یا ٹھیکیدار سے لی ہوئی ہوتی ہے۔'' ان حالات میں لاہور میں ایک بھٹہ پر کام کرنے والے طلعت کے مطابق ''والدین اور اُن کے بچوں کو اپنی ساری زندگی محکومی میں گزارنا پڑتی ہے کیونکہ یہ بچے پیدا ہی اُن کے والدین کے یہاں ہوئے جو غلامی میں پھنسے ہوئے تھے۔'' گویا والدین خود مفلسی کے گھناؤنے چکر کا شکار ہوتے ہیں۔

کچھ لوگ بچوں کے کام کرنے کے حق میں ہیں اگر اُن کا کام خطرناک نہ ہو مثلاً فٹ بال کی سلائی۔ تاہم کچھ دوسرے لوگوں کا کہنا تھا کہ 10 سالہ ذینب کے انجام سے (جو اپنے کزن کے ساتھ دودھ خریدنے گئی تھی اور جس کی لاش دس دن بعد ملی) لگتا ہے کہ بچے آسانی سے جرائم پیشہ عناصر کا شکار ہو سکتے ہیں اور اُنہیں ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جہاں اُنہیں تحفظ حاصل ہو۔ چنیوٹ میں اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے سعید کا کہنا تھا کہ ''فٹ بال کی سلائی، چائے کے سٹال پر کام کرنا یا کسی ورکشاپ میں سادہ کام کرنا خطرناک مزدوری کے زمرے میں نہیں آتا۔ چنانچہ ان کاموں کو فروغ دینا چاہیے اور اس سلسلے میں مزدور بچوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔''

دوسری طرف خیبر پختونخوا میں ایک فوکس گروپ مباحثے میں شریک غفور خان کا کہنا تھا کہ ''قانون کے مطابق کانوں میں بچوں سے کام لینے کی سخت ممانعت ہے اور ملازمت قومی شناختی کارڈ کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ چنانچہ بچے کانوں کے باہر برتن دھونے، کھانا پکانے اور جنریٹر چلانے جیسے معمول کے کام تو کرسکتے ہیں لیکن اُنہیں کانوں میں داخل ہونے نہیں دیا جاتا۔''

گلگت بلتستان میں شرکا سے پوچھا گیا کہ چیری چننے والے مزدوروں میں بچے بھی شامل ہوتے ہیں یا نہیں تو اُن میں سے ایک افتخار نے جواب دیا کہ ''ہاں۔ بچے بھی مزدوری کرتے ہیں۔ اُن کی عمریں سات سے پندرہ سال تک ہوتی ہیں۔ گلگت بلتستان میں کچھ بچے ورکشاپس اور شاپنگ سٹورز میں خاصے سخت کام بھی کرتے ہیں۔ وہ 10 سے 12 گھنٹے تک کام کرتے ہیں اور اُنہیں اس کا بہت کم معاوضہ ملتا ہے۔ اُن کے والدین بہت غریب ہوتے ہیں اور اسی لیے اُنہیں کام پر بھیجتے ہیں۔''

یونس نامی ایک مزدور نے بتایا کہ ''مزدوری کرنے والے بچوں میں بالغ مردوں یا عورتوں جیسی جسمانی طاقت نہیں ہوتی جیسا کہ خطرناک کام کرنے والے بچوں کو پہنچنے والے جسمانی نقصان کی کئی مثالوں سے ظاہر ہے مثلاً قالین بننے والے کئی بچوں کو دمہ ہوجاتا ہے۔ حاصل بحث یہ ہے کہ بچوں کی مزدوری غلامی کی بدترین شکل ہے۔''

آنکھوں میں آنسو لیے بھٹوں پر کام کرنے والی ایک ماں نے کہا ''اپنے بچوں کو اپنے ساتھ کام کے لیے کہنا ہمارے لیے اختیار کی بات نہیں ہوتی۔ میں خود بیمار ہوں اور میرا خاوند اکیلے روزانہ 1500 اینٹیں نہیں بنا سکتا چنانچہ میری بیٹیاں باپ کے ساتھ مل کر کام کرتی ہیں تاکہ روزانہ اس ہدف کو حاصل کرسکیں۔

حکومتی نگرانی اور معائنے کا فقدان

سماجی انصاف اور عورتوں کے حقوق کے لیے کام کرنے والی فوزیہ وقار نے کہا کہ ''کام کے حالات اور شرائط کی نگرانی کے لیے محکمہ محنت کی طرف سے معائنہ بنیادی چیز ہے۔ اس انتظام کو ختم کرنے کی بجائے زیادہ مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔'' حکومت کی طرف سے معائنے سے صرف نظر مزدوروں کے استحصال کا باعث بننے والے ہر غیر قانونی رواج کے جاری رہنے کا اولین سبب ہے۔

گلگت میں چیری چننے والے ایک مزدور نے کہا ''گلگت بلتستان میں جہاں ہم نوکری کرتے ہیں کبھی کسی سرکاری محکمے کا کوئی کارندہ نہیں آیا۔ ہمارے خیال میں گلگت میں ایسے کسی ادارے کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر ایسا کوئی محکمہ موجود ہے تو وہ غیر فعال ہے۔ چنیوٹ میں ایک مزدور رحیم نے کہا ''یہ ملک اسلامی کہلاتا ہے لیکن یہاں جہنم سے بدتر ظلم ہوتے ہیں۔ کارخانوں کے مالک محکمہ محنت کو معائنہ کرنے ہی نہیں دیتے۔ اس مقصد کے لیے معائنہ کاروں کو رشوت دیتے ہیں تاکہ وہ اُن کے کارخانوں کا معائنہ نہ کریں۔ یہ بات کس طرح معلوم کی جاسکتی ہے کہ مزدوروں کے پاس سماجی بہبود کے کارڈ ہیں بھی یا نہیں اور اُن کا فائدہ کیا ہے؟''۔

بھٹہ مزدور بشیر نے کہا ''جس دن کسی بھٹہ کا معائنہ ہونا ہو بھٹے والوں کو پہلے سے اندرون خانہ اطلاع پہنچ جاتی ہے۔ اُس دن بچوں کو بھٹہ سے دور رکھا جاتا ہے۔ ایک اور مزدور عارف نے اس پر اضافہ کیا کہ ''بعض اوقات بچوں کو بھٹے کے مالک کے دفتر میں کمروں میں بند کردیا جاتا ہے۔ عین اُس جگہ پر جس کا فرضی طور پر معائنہ ہو رہا ہے۔''

کم از کم اجرت کے معیار پر عمل درآمد کا فقدان

خطرے سے دوچار گروہوں کے حقوق سے متعلق رائج قوانین قانون سازی کے ڈھانچے اور اداروں پر انضباطی اختیار کے فقدان کے باعث غیر مؤثر ہو رہے ہیں۔ اب قرضے کی قانونی اجازت ہونے کے باعث پیشگی پھر سے ایک بار بار پیش آنے والا مسئلہ بن گئی ہے۔ پاکستان میں کم از کم یومیہ اجرت کا معیار 1200 روپیہ ہے۔ تاہم اکثر عورتوں کو خود اپنی اجرت تک رسائی حاصل نہیں ہے کیونکہ اُن کے خاندانوں کے مرد مزدور براہ راست ٹھیکیدار سے اُن کی اُجرت وصول کرلیتے ہیں: یہ بات مشاورت میں شریک ایک عورت

نے بہت تکلیف دہ انداز میں بتائی۔ پیشگی یا قرض کے نام پر مزدوروں کا استحصال جاری ہے۔ تعلیم کی کمی کی وجہ سے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے مزدوروں کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ انہوں نے بھٹہ مالکان سے بچے کی پیدائش، خاندان کے کسی فرد کی بیماری یا کسی شادی کے موقع پر کتنی رقم قرض لے رکھی ہے۔ یہ قرض بڑھتا رہتا ہے یہاں تک کہ کام کی کوئی بھی مقدار اس کی ادائیگی کے لیے کافی نہیں ہوسکتی۔

ایک بھٹہ مزدور عرفان کا کہنا تھا کہ ''کم از کم اجرت 1200 روپے ہے لیکن ہمیں کبھی 600 روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ بھٹہ کا مالک کہتا ہے میں تمہیں اس سے زیادہ پیسے نہیں دوں گا کیونکہ تم مجھ سے پیشگی رقم لے چکے ہو۔''

لاہور میں ایچ آر سی پی کے زیر اہتمام ایک مشاورت میں مزدوروں کی حالتِ زار کو نمایاں کرتے ہوئے ایک وکیل نے کہا ''استحصال کا دائرہ مناسب اجرت کی عدم ادائیگی سے وسیع تر ہے۔ چنانچہ نگرانی کی ضلعی کمیٹیوں کے رکن شہریوں کو یہ بات یقینی بنانی چاہیے کہ جبری مزدوری ایکٹ کے تحت ممنوع کوئی بھی رواج عمل میں نہ آئے۔ اس سلسلے میں جو بھی کمی بیشی اُن کے علم میں آئے اُنہیں اس کی خبر دینی چاہیے۔''
ایسی مشاورت میں شریک خالد محمود کا تبصرہ تھا کہ ''اِس سال اپنی مدت کے آغاز کے بعد سے پنجاب کی صوبائی کمیٹی کا صرف ایک اجلاس ہوا ہے۔ بی ایل ایف کے مہر صفدر نے محکمہ محنت کی معائنہ ٹیم کے ذریعے نگرانی اور جانچ کا ایک باقاعدہ نظام قائم کرنے کی اہمیت پر زور دیا اور نگرانی کی ضلعی کمیٹیوں کے ارکان سے درخواست کی کہ وہ اس مقصد کے لیے زیادہ پیش عملی سے کام لیں۔

مزید برآں گلگت بلتستان میں ایچ آر سی پی ٹیم سے ایک گفتگو کے دوران جب مزدوروں سے پوچھا گیا کہ کیا وہ اپنے حالات کار سے مطمئن ہیں تو اُن کا جواب تھا کہ ''نہیں۔'' ''ہم اپنے حالات سے مطمئن نہیں ہیں۔ ہمارے معاوضے میں اضافہ ہونا چاہیے اور کام کے اوقات میں کمی ہونی چاہیے۔ ریاست کی جانب سے بھی ہماری زندگیوں کو بہتر بنانے کی کچھ نہ کچھ کوشش ہونی چاہیے تاکہ ہم اپنی کمائی سے اپنے اخراجات پورے کرسکیں اور عزت کی زندگی جی سکیں۔'' ایک مزدور سلمان نے جواب دیا کہ ''اس کا انحصار ہمارے کام کی نوعیت پر ہے۔ مثلاً سبزی کے کھیتوں پر کام کرنے کی صورت میں ہماری کمائی اس نسبت سے ہوتی ہے کہ ہم نے کتنے کلوگرام سبزیاں چُنی ہیں چنانچہ ہم زیادہ سے زیادہ گھنٹے کام میں لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عام طور پر ہم دو شفٹوں میں کام کرتے ہیں۔ پہلی دفعہ صبح سویرے اور دوسری دفعہ شام تک۔ ہم دن بھر میں کم از کم آٹھ گھنٹے کھیت میں کام کرتے ہیں۔''

محکمہ محنت کی نااہلی سے پیدا ہونے والی دقتوں کی وضاحت کرتے ہوئے کوئلے کے کان کن افسر خان نے کہا ''کوئے کے کان کنوں کے کوئی باقاعدہ تنخواہ کے پیکیج نہیں ہیں۔ وہ عارضی معاہدے کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔ ہر کان کن کو فی ٹن 5,000 روپے ملتے ہیں۔ نتیجتاً ہر کان کن 30,0000 سے 35,000 روپے مہینہ تک کماتا ہے۔ 70,000 یا 100,000 روپے کمانے کی مثالیں بہت شاذ و نادر ملتی ہیں۔ دوسری طرف مالکان لاکھوں روپے کماتے ہیں لیکن کان کنوں کے تحفظ کے لیے ضروری آلات اور لازمی سہولتیں تک مہیا نہیں کرتے۔ گفتگو میں شریک ایک اور شخص حامد خان نے اپنا مشاہدہ بیان کیا کہ ''خیبر پختونخوا کے مقابلے میں بلوچستان کے کان کنوں کو زیادہ سہولتیں میسر ہیں۔ مثلاً ان کی اپنی انجمن ہے اور انہیں ضرورت پڑنے پر پیشگی ادائیگی مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے بچوں کو تعلیمی وضائف بھی ملتے ہیں۔''

سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونا

آج تک، مزدوروں کے پاس شناختی کارڈ اور سماجی تحفظ کے کارڈ نہیں ہیں۔ سماجی تحفظ کے کارڈ بنوانا بھٹوں اور کارخانوں کے مالکان کی ذمہ داری ہے لیکن اس قانون پر عمل درآمد کی نگرانی ریاست کا کام ہے۔ عدالتِ عظمیٰ کے وکیل اور ایچ آر سی پی کے تربیت کار اسد جمال کا کہنا تھا کہ 1935 کے قانون کے مطابق اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ہر صنعتی مزدور کو سماجی تحفظ کے کارڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اپنے حقوق کے بارے میں دوسرے مزدوروں سے بھی کم آگاہی کی وجہ سے افغانستان سے آنے والے مزدور جبری مزدوری کا زیادہ نشانہ بن سکتے ہیں۔ ملتان میں ایچ آر سی پی کے زیرِ اہتمام ایک مشاورت میں ایک تحقیق کار اور سماجی کارکن نے یہ تبصرہ کیا۔ ''آئین کی دفعہ 125 کے مطابق تعلیم بچوں کے لیے لازمی ہے۔ چنانچہ ریاست کا فرض ہے کہ ایسی تمام سہولتیں فراہم کرے جو اس امر کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہیں کہ تمام بچے اسکول جائیں۔ دوسرے درجے میں یہ ذمہ داری اُن کے والدین اور اُن کے بعد بھٹوں کے مالکان پر عائد ہوتی ہے۔ سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونے کے سبب بچوں کو وہ تعلیمی وظیفے نہیں مل سکتے جن کے وہ بصورت دیگر حقدار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ پرچی کا نظام جس کے تحت کوئی بھٹہ مالک کسی مزدور کو کسی دوسرے مالک کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیج دیتا ہے کہ پیشگی ادائیگی کے باعث کوئی مخصوص رقم اس کے ذمہ ہے، درحقیقت ایک گروی مزدور کو ہیرا پھیری سے فروخت کرنا ہے۔ اس رواج پر اب تک عمل ہو رہا ہے۔

فیصل آباد میں ایک فوکس گروپ مباحثے میں شریک یوسف کا کہنا تھا کہ یہ معلوم کرنا کہ کسی بھٹہ مزدور کے پاس سماجی تحفظ کا کارڈ ہے یا نہیں بھٹہ کے مالکان کی ذمہ داری ہے۔ اگرچہ یہ کارڈ استحصال کے انسداد کا مؤثر ذریعہ نہیں ہو سکتے۔'' کسی جبری مزدور کے بیروزگار ہونے پر سماجی تحفظ کے نہ ہونے کا نقصان مزید بڑھ جاتا ہے۔ ''جب ہم بے روزگار ہو جاتے ہیں تو اپنے اخراجات برداشت کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے وقت میں ہمیں کھانا بھی دکانداروں سے ادھار لینا پڑتا ہے۔

بی ایل ایف کی مجلسِ عاملہ کے رکن مہر صفدر نے اس بات کی نشاندہی کی کہ مذہب کی بنیاد پر تفریق عام ہے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ''پاکستان میں اینٹوں کے 25,000 بھٹے ہیں۔ ان میں سے 15,000 پنجاب میں ہیں۔ جبری مزدوری کے شکار لوگوں میں سے 80 سے 60 فیصد کا تعلق اقلیتی برادریوں سے ہے۔ اُن سے نہ صرف اس لیے بُرا سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ غریب ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ اُن کا تعلق اقلیت سے ہے۔'' انہوں نے سماجی تحفظ کے کارڈ نہ ہونے کو اُن بڑے بڑے مسائل میں شمار کیا جن کی وجہ سے مزدوروں کا استحصال جاری رہتا ہے اور اُن کے خلاف تفریق بڑھتی جاتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ریاست تمام مزدوروں کو کم از کم اجرتوں کی ادائیگی اور سماجی تحفظ کے کارڈ کے اجراء کو یقینی بنادے تو اُن کے پاس ہسپتال کے بل، شادیوں اور جنازوں جیسے اخراجات کی گنجائش موجود رہے گی۔ اس کے نتیجے میں ملازمین کو دیے جانے والے قرضے کم ہو جائیں گے اور یوں پیشگی کا لین دین بھی بلا دقت چلنے لگے گا۔ ملتان میں ایک فوکس گروپ مباحثے کی میزبانی کرتے ہوئے ایچ آر سی پی کی محترمہ طاہرہ حبیب نے اس امر کی نشاندہی بھی کی کہ قومی شناختی کارڈ کو مزدوری کے لیے لازمی شرط ٹھہرانے کو یقینی بنا کر بچوں سے مشقت لینے کے رواج پر قابو پایا جا سکتا ہے۔
خود مزدوروں کا ناخواندہ ہونا ایک اور مسئلہ تھا جسے روشنی میں لایا گیا۔ ان میں سے کچھ کا کہنا تھا کہ بسا اوقات اُنہیں یہ بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اُنہیں کتنی ادائیگی ہونی چاہیے اور یہ کہ ان سے جس رقم کا وعدہ کیا گیا تھا وہ اُنہیں مل رہی ہے یا نہیں۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تمام ادائیگیاں منتظم خود کرتے ہیں اور مزدوروں سے انگوٹھوں کے نشان حاصل کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی بھی مزدوروں کو اُن کے معاہدات کی تفصیل سے آگاہ نہیں کرتے۔

کام کے حالاتِ کار

اس سوال کے جواب میں کہ آپ کے حالات کار میں

مثبت تبدیلی کے لیے کس چیز کی ضرورت ہے آدم مسیح کا کہنا تھا کہ ''ریاست کو ہمارے قرضوں کی ادائیگی میں ہماری مدد کرنی چاہیے۔'' اُن کی یہ بھی رائے تھی کہ حکومت کو انہیں چھوٹے کاروبار شروع کرنے کے لیے رقم دینی چاہیے۔ ایچ آر سی پی کی سینئر مینیجر طاہرہ حبیب کا کہنا تھا کہ ''قانون کی حکمرانی پر عملدرآمد میں رخنوں کو بند کرنے کے لیے بحث کو شروع کرنا ضروری ہے۔''

قیصر نامی ایک مزدور نے کہا ''ہمیں مقتدر لوگوں سے کوئی امید نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ کوئی بھی ہمارے حالات کار کا جائزہ نہیں لے گا۔ کوئی قانون سازی نہیں ہوگی اور منتخب نمائندے ہماری حالتِ زار اور ہماری ضروریات کو یوں ہی نظر انداز کرتے رہیں گے۔ حکومتیں آتی اور جاتی رہیں گی لیکن مزدوروں کی بدحالی جوں کی توں رہے گی۔ مقتدر لوگوں کو ہماری پروا نہیں۔ وہ اپنی ہی بہبود اور اپنے ہی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔'' گلگت بلتستان میں چیری چننے والے شوکت نے کہا ''ہاں، ہم جب چاہیں نوکری چھوڑ سکتے ہیں لیکن ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ہمارے لیے کوئی نئی نوکری تلاش کرنا بہت دشوار ہوگا۔''

کام کی جگہ پر محفوظ ماحول کا فقدان

کام کی جگہ پر محفوظ ماحول کا نہ ہونا بھی مزدوروں کے لیے ماحول کو لاحاصل بنانے میں ایک کلیدی جزو ہوتا ہے۔ اکثر مزدوروں نے اس بات کی تصدیق کی کہ جہاں وہ کام کرتے ہیں وہاں کسی قسم کے حفاظتی اقدامات نہیں کیے گئے۔ گلگت بلتستان میں چیری چننے والے رضا نے بتایا ''گلگت بلتستان میں نجی اداروں میں حفاظتی اقدامات کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ ملازمین کو ایسے اقدامات کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں''۔ انہوں نے مزید کہا کہ ''ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمیں کام کے دوران کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔''

10 اپریل 2019 کو درہ آدم خیل میں ایک کان میں دھماکے میں 4 کان کن ہلاک ہو گئے تھے۔ کانوں میں کچھ دھماکے کان کنوں کے نادانستہ فعل سے بھی ہوئے۔ زیرِ زمین کھدائی سے نکلنے والی میتھین گیس ہوا کے ساتھ مل کر ایک بہت دھماکہ خیز آمیزہ بنا دیتی ہے۔ ایسے ہی ایک دھماکے کے نتیجے میں ایک کارکن جو کھدائی کرنے والوں میں شامل تھا شدید زخمی ہوا اور ڈیڑھ ماہ تک ہسپتال رہا ایک اور مزدور سال بھر سے بستر پر ہے۔

ایسے حادثوں کا شکار ہونے والوں کو ہسپتال لے جانے کے لیے کچھ کانوں کی اپنی ایمبولینسیں ہیں لیکن اکثر کانوں میں ایسی سہولتوں کا فقدان ہے۔ اس موقع پر ریسکیو 1122 کی اور سرکاری ایمبولینسوں کو فی الفور جائے حادثہ پر آنا پڑا تھا۔

حال ہی میں ڈیگاری میں کوئلہ کی کان کے ایک حادثے میں 10 کارکن ہلاک ہوئے اور ایک زخمی ہوا۔ تاہم یہ سب لوگ افغان تھے۔ اس لیے ان کی موت کے سرٹیفکیٹ جاری نہیں ہوئے۔ اس کی بجائے لاشیں برآمد ہونے پر انہیں فوراً افغانستان بھجوا دیا گیا۔ کوئلے کے کان کن رحمان نے اس حادثے کا احوال سنایا ''جس کان میں یہ حادثہ ہوا وہ حکومت کی ملکیت ہے جس نے اسے ایک نجی کمپنی کو ٹھیکے پر دے رکھا ہے۔ اس کے باوجود حکومت اس کان میں کام کی نگرانی نہیں کر رہی ہے کیونکہ ٹھیکے کے معاہدے میں صرف حکومت کو واجب الادا رقم کی تفصیل ہے۔ یہ حادثہ بجلی کی بوسیدہ تاروں کی وجہ سے پیش آیا جن کی آخری دفعہ 1959 میں مرمت ہوئی تھی اور اس لیے کہ کسی ناگہانی آفت کی صورت میں نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کان گیس سے بھر گئی تھی جس کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔''

آخری بات یہ ہے کہ مالکان یونین بننے ہی نہیں دیتے جس کی وجہ سے مزدوروں کے مسائل پر کبھی کام نہیں ہو پاتا۔

سفارشات

1- جنوری 2016 میں پنجاب میں جاری ہونے والے آرڈیننس کو جس کے تحت پیشگی کے نظام کو بحال کر کے اس کی حد 50,000 روپے مقرر کی گئی ہے واپس لیا جائے۔

2- حالات کار میں بہتری لانے، کم از کم اجرتوں سمیت محنت کشوں سے متعلق تمام قوانین پر عملدرآمد، کام کے لیے محفوظ ماحول کی یقین دہانی اور کام کی جگہوں پر جبری مزدوری اور بچوں سے کام لینے جیسے رواجوں کا پتہ چلانے کے لیے محکمہ محنت کی طرف سے معائنے کو باقاعدہ بنایا جائے۔ اس مقصد کے لیے لیبر انسپکٹرز کی مطلوبہ تعداد کی بھرتی کا عمل مزید تاخیر کے بغیر شروع کیا جائے۔

3- محنت سے متعلق قوانین پر مؤثر عملدرآمد کے لیے ضلعی نگران کمیٹیوں کو فعال بنایا جانا چاہیے نیز اُن کے کام کی نگرانی کے لیے بھی کسی قسم کا جواب دہی کا نظام ہونا چاہیے۔

4- ملک بھر میں کام کی جگہوں پر قومی شناختی کارڈ بنانے کے لیے ایک مہم شروع کی جانی چاہیے تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ وہاں کام کرنے والے تمام لوگوں کو ملازمین کی حیثیت سے اندراج ہو جائے۔ سماجی تحفظ کے کارڈ کے اجراء کو بھی اسی طرح یقینی بنایا جا سکتا ہے۔

5- کم از کم اجرتوں کی ادائیگی کے قانون پر من وعن عملدرآمد ہونا چاہیے۔

6- جن مزدوروں، ورکروں کے پاس فی الوقت کمپیوٹرائزڈ قومی شناختی کارڈ نہیں ہیں اُن کے اندراج کے لیے کوئی طریق کار وضع کیا جانا چاہیے اور جب تک ان کے کارڈ نہیں بنتے اس پر عمل درآمد ہونا چاہیے۔

7- جبری مزدوری کے قانون میں مناسب ترمیم کے ذریعے مزدور بچوں کے اوقات کار کو محدود کرنے کو یقینی بنانا چاہیے تاکہ اُنہیں تعلیم حاصل کرنے کے لیے مناسب وقت دیا جا سکے۔

8- صحت اور سلامتی کے حالات سے متعلق کم از کم معیار کو یقینی بنانا چاہیے۔

9- آبادی میں اضافہ پر قابو پانے کے لیے محکمہ آبادی کنٹرول کو چاہیے کہ قانون سازی کے ذریعے ایک خاص تعداد سے زیادہ بچے پیدا کرنے والے والدین کی جوابدہی کو یقینی بنائے۔

10- پولیس کو مزدوروں کی طرف سے دائر کی گئی شکایات کو وصول کرنے کے لیے جواب دہ بنایا جانا چاہیے۔

11- زرعی بینکوں کی طرف سے مہیا کیے جانے والے قرضوں کی سہولت مزارعوں کو بھی ملنی چاہیے۔ فی الوقت یہ سہولت صرف زمین کے مالکان کو میسر ہے۔

12- گروی مزدوروں کے بچوں کے لیے تعلیم کے خصوصی انتظامات ہونے چاہئیں۔

13- کان کنی میں صحت اور سلامتی کے 1995 کے معاہدے کی توثیق کے علاوہ حکومت پاکستان کو زیر زمین کانوں کے لیے تجویز کیے گئے 2006 کے ضابطے پر بھی عمل کرنا چاہیے۔ کانوں میں ہونے والے حادثات کی جامع تفتیش ہونی چاہیے اور کانوں کے مالکان کی غفلت ثابت ہونے کی صورت میں انہیں بھاری جرمانوں کی سزا ملنی چاہیے اور ان کے لائسنس منسوخ ہو جانے چاہئیں۔ مزید برآں تپ دق اور جلدی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے مزدوروں کے باقاعدہ معائنے کے لیے صحت کی سہولتیں مہیا کی جانی چاہئیں۔

حوالہ جات

www.riabarakergillette.com

2- آئی اے رحمان۔ بچوں کی مشقت کا ناقص قانون۔ ڈان۔ 2016/8/9

https://epaper.dawn.com/DetailImage.php?StoryImage=08_09_2016_008_002

وہم وگمان سے ماورا دنیا

زاہدہ حنا

پوری دنیا مہینوں خوف سے سہمی اپنے گھروں میں قید رہی۔ اب آہستہ آہستہ لاک ڈاؤن ختم ہورہا ہے۔ قواعد وضوابط میں نرمی کی جارہی ہے اور لوگوں نے گھروں سے نکلنا شروع کردیا ہے۔ حالات ٹھیک نہیں ہوئے ہیں، کورونا وائرس سے بچاؤ کی اب تک کوئی دوا یا ویکسین بھی تیار نہیں ہوئی ہے، شاید اس کام میں 6 ماہ یا ایک سال بھی لگ جائے لیکن ایک بات یہ طے ہے کہ انسانوں کو کافی عرصے تک اس وائرس کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہوگی اور خوف کو لاشعور میں ڈال کر زندگی کا ایک نیا طرز اختیار کرنا ہوگا۔

ماضی کی ایک دو نہیں بلکہ کئی عادتوں اور طور طریقوں کو بھی تبدیل کرنا ہوگا۔ ایسا کرنا یقیناً بہت مشکل ہے کیونکہ ہزاروں برس کی عادتیں اچانک تبدیل نہیں کی جاسکتیں لیکن اب ایسا کرنا سب کی ضرورت اور مجبوری بن گئی ہے، ذرا سی بے احتیاطی جان لیوا ہوسکتی ہے بالخصوص 10 سال سے کم عمر بچوں اور 55 سال سے زیادہ عمر کے لوگ یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس وبا کے بعد ہماری زندگی میں کیا تبدیلیاں ناگزیر ہوجائیں گی۔

پچھلے چار ماہ کے تجربے نے بہت کچھ بدل دیا ہے۔ پہلے ہم چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے براہ راست رابطے میں آیا جائے، اب ترجیح یہ ہوتی ہے کہ لوگوں اور پرہجوم جگہوں سے بچا جائے۔ پہلے اگر کسی کام کے بارے میں آجر سے یہ کہا جاتا تھا کہ گھر پر بیٹھ کر یہ کام کیا جاسکتا ہے تو جواب ملتا تھا کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے؟ اب کسی سے کہا جائے کہ میں آپ کے پاس حاضر ہوکر یہ کام کردوں گا تو جواب عموماً یہی ملے گا کہ بھلا تشریف لانے کی کیا ضرورت ہے، آپ یہ کام گھر سے بھی تو کرسکتے ہیں۔ کبھی ساتھ اور قربت سے تحفظ کا احساس پیدا ہوتا تھا، اب دور رہ کر انسان خود کو محفوظ تصور کرنے لگیں گے۔

اس حوالے سے دیکھتے ہیں کہ بعض ماہرین کی رائے کیا ہے۔ کولمبیا یونیورسٹی کے شعبہ نفسیات کے پروفیسر پیٹر۔ ٹی کول مین کا خیال ہے کہ کورونا کے حملے کے بعد اب قوموں کی نفسیات میں تبدیلی رونما ہوگی۔ ان کا خیال ہے امریکا جیسا ملک جو 50 سال سے جس سیاسی اور ثقافتی محاذ آرائی میں پھنسا ہوا ہے، وہ اب اس سے نکل آئے گا۔ یہ وائرس لوگوں کو متحد کردے گا کیوں کہ یہ ایک ایسا بیرونی خطرہ ہے جو ہر نسلی، لسانی، ثقافتی اور سیاسی شناخت کو یکساں طور پر متاثر کررہا ہے۔

لہٰذا لوگ اب یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اگر ہم آپس میں لڑتے رہے تو یہ یا اس کے بعد آنے والا کوئی نیا وائرس ہم کو اجتماعی طور پر فنا کردے گا۔ گویا یہ ایک ایسا مشترکہ دشمن ہے جو تمام تلخیاں اور محاذ آرائیاں ختم کرکے لوگوں کو متحد کردے گا۔ امریکا کے نیول وار کالج کے پروفیسر ٹام نکولس کا نقطہ نظر ہے کہ ہم زندگی کے معاملات میں بہت مگن ہوگئے تھے اور سنجیدہ باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتے تھے۔ اب لوگ ماہرین کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اور ان کی باتوں کو اہمیت دینے لگے ہیں۔ اب لوگوں کی نظر میں ڈاکٹر اہم ہوگئے ہیں۔

اس وبا کے دوران حکومتوں کی کارکردگی دیکھ کر لوگ یہ سوچنے لگے ہیں کہ حکومت کرنا ایک سنجیدہ عمل ہے اور اس کے لیے جذباتی نہیں بلکہ سنجیدہ لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سماجیات کے پروفیسر ایرک کلن برگ کا تجزیہ ہے کہ اس وبا نے منڈیوں پر قائم سماج اور انتہا درجے کی انفرادیت پسندی پر کاری ضرب لگائی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ معیشت اور منڈی پر حاوی طبقات اور ان کی نمائندگی کرنے والے حکمرانوں نے اس تباہ کن وبا کے دور میں عام آدمی کے مفادات کا کم خیال رکھا ہے جس سے لوگوں کو بھاری جانی اور مالی قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اب حکومتوں کو اپنا انداز بدلنا ہوگا اور صحت عامہ اور عام لوگوں کو اشیا کی فراہمی پر کہیں زیادہ سرمایہ کاری کرنی ہوگی۔

لوگ اب یہ دیکھا کریں گے کہ سیاسی جماعتوں کے پاس کیا کوئی ایسا منصوبہ موجود ہے جس سے وہ کسی بھی ناگہانی مصیبت کا بہتر انداز میں سامنا کرسکیں اور لوگوں کو مرنے سے بچاسکیں۔ اسی طرح ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ لوگوں میں خوف کا احساس جاں گزیں رہتا ہے لہٰذا وہ سکون پانے کے لیے بڑی تعداد میں مذہبی تقریبات میں شرکت کرتے ہیں۔

اب ان پر کورونا کا خوف غالب ہے جس کی وجہ سے دنیا میں تمام مذاہب کی بڑی بڑی عبادت گاہیں بند کردی گئی ہیں۔ اس بات کا پورا امکان پیدا ہوگیا ہے کہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا رویہ ترک کردیں گے، مذہبی بنیادوں پر محاذ آرائی میں کمی ہوگی اور لوگ مذاہب کی تفہیم کے حوالے سے بھی نیا انداز اختیار کریں گے۔ ایک تجزیہ نگار کا خیال ہے کہ اس وبا نے لوگوں کو اس امر پر متحد کردیا ہے کہ وہ حکومتوں پر دباؤ ڈالیں کہ ہیلتھ کیئر کے نظام کا از سر نو جائزہ لیا جائے اور اسے بہتر بنانے کے لیے غیر معمولی اقدامات بروئے کار لائے جائیں۔ روز ویلیٹ انسٹی ٹیوٹ کے نائب صدر اسفھ اسٹرلنگ نے بڑا اہم تجزیہ کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں کے دوران دنیا میں کئی وبائیں آچکی ہیں اور حکومتوں کو اس بوجھ کو برداشت کرنا پڑا ہے۔ اس دوران یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ دنیا میں منڈی کی معیشت پر قائم نظام کے تحت دواؤں اور ویکسین کی تحقیق اور تیاری کا نظام بری طرح ناکام ثابت ہوا ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے کہ نجی فارما سیوٹیکل کمپنیاں کسی بھی ویکسین اور ادویات کو اس وقت تک تیار کرنے میں دلچسپی نہیں لیتی ہیں جب تک اس میں ان کو یقینی منافع نظر نہیں آتا۔ اس وبا کے دوران بھی یہ مظہر کھل کر سامنے آیا ہے کہ مصیبت پڑنے پر حکومتوں اور دیگر ذرائع سے کافی سرمایہ فراہم کرنے کے باوجود کورونا وائرس کی ویکسین آنے میں سال سے اٹھارہ مہینے لگ جائیں گے۔

منڈی کی معیشت میں کوئی ادارہ یا کاروباری کمپنی عوام اور صارف کے مفاد میں سرمایہ کاری نہیں کرتی بلکہ وہ ایسا اس وقت کرتی ہے جب اسے یقین ہوجاتا ہے کہ سرمایہ کاری سے اسے یقینی منافع حاصل ہوگا۔ اس وائرس نے یہ سفاک حقیقت ا؟ شکار کردی ہے کہ عوام کو منڈیوں کے ان بے رحم طاقتوں کے رحم وکرم پر نہیں چھوڑا جاسکتا جنھیں انسانی زندگی کی کم اور اپنے منافع کی زیادہ فکر رہتی ہے۔ دنیا کے امیر ترین ملک ہوں یا غریب ملک ہر جگہ منافع کے حصول کو پہلی ترجیح دیتی جاتی ہے اور عوام کی زندگیوں کی چنداں اہمیت نہیں ہوتی۔

لہٰذا اب حکومتوں کے سامنے صرف دو راستے ہی باقی بچے ہیں وہ ادویات اور صحت سے متعلق نجی کاروباری کمپنیوں کے مفادات کو پیش نظر رکھیں یا عوام کو لاکھوں کی تعداد میں مرنے، بیمار ہونے کے لیے چھوڑ دیں اور معیشت کو تباہ ہونے سے بچائیں۔ آیندہ آنے والے دنوں میں حکومتوں کو اپنی حکمت عملی تبدیل کرنی ہوگی۔ حکومتوں کو خود ایک بڑی ادویاتی یا فارما کمپنی کی طرح کام کرنا ہوگا۔ منافع کی فکر سے آزاد ہوکر انھیں جان بچانے والی ادویات اور ویکسین کی تیاری اور تحقیق میں اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ گویا حکومتیں خود فارما کمپنیاں بن جائیں گی۔

امریکا اور یورپ سمیت کئی ملکوں کی حکومتوں کو کئی کھرب ڈالر کا نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ وہ سرکاری شعبے میں ویکسین اور ادویات کی تحقیق اور جلد تیاری کے لیے منافع کی لالچ کیے بغیر چند ارب ڈالر خرچ کرسکتی ہیں۔ انھوں نے ایسا نہ کیا تو ووٹر انھیں سیاست کے میدان سے نکال باہر کریں گے۔

کورونا کی وبا جب بھی ختم ہو یہ امر طے ہے کہ پوری دنیا کے سات ارب سے زیادہ لوگ جس ہولناک تجربے سے گزرے ہیں اس نے انھیں پرانی سوچ ترک کرکے نئی سوچ اور طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ کورونا کے بعد دنیا میں سیاست، معیشت، معاشرت، اقدار، رہن سہن، عادت واطوار، جذباتی اور نفسیاتی کیفیات سب تبدیل ہوجائیں گی۔ اس نئی دنیا میں ہر چیز بدلی ہوئی ہوگی۔

ایک ایسی دنیا جو چار ماہ پہلے تک ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں تھی۔ (بشکریہ ایکسپریس اردو)

اقلیتی کمیشن میں شامل ہونے کی درخواست نہیں کی، جماعت احمدیہ

پاکستان میں جماعت احمدیہ کا کہنا ہے کہ انھوں نے کبھی کوئی ایسی درخواست نہیں کی کہ انھیں اقلیتی کمیشن میں شامل کیا جائے اور یہ کہ اس بحث سے متعلق حکومتی عہدیداروں کے بیانات سے انھیں مزید امتیازی سلوک اور نفرت کا نشانہ بنایا جاسکتا ہے۔

جماعت احمدیہ کی جانب سے یہ بیان ایک ایسے وقت میں سامنے آیا ہے جب چند روز قبل احمدی برادری کو اقلیتی کمیشن میں شامل کرنے سے متعلق تجویز کابینہ کے ایک اجلاس میں سامنے آئی تھی۔

خیال رہے کہ پاکستان کے آئین میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے۔ جماعت احمدیہ کے ترجمان کے مطابق وہ آئینِ پاکستان اور اس میں دی گئی مذہبی آزادی کو تو مانتے ہیں لیکن اس میں خود کو غیر مسلم قرار دیے جانے کو تسلیم نہیں کرتے۔

احمدی برادری کا موقف

یہ معاملہ اس وقت زیر بحث آیا جب مقامی ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں سامنے آئیں کہ حکومت کی جانب سے احمدی برادری کو اقلیتی کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

اس معاملے پر بی بی سی سے بات کرتے ہوئے پاکستان میں جماعتِ احمدیہ کے ترجمان سلیم الدین کا کہنا تھا کہ 'ہم نے اس کمیشن میں شامل ہونے کی درخواست نہیں کی تھی اور اس معاملے پر نہ ہی حکومت کی جانب سے ہم سے رابطہ کیا گیا۔'

اقلیتی کمیشن میں شامل نہ کیے جانے پر وہ کہتے ہیں

مرضی تھی نہ ہمیں اس کا افسوس ہے، کسی بھی ملک کی پارلیمان کو یہ اختیار نہیں کہ وہ کسی کے ایمان کا فیصلہ کریں کیونکہ یہ انسان اور اس کے خدا کا معاملہ ہے۔

ان کے مطابق ملک میں اقلیتی کمیشن کی اتنی اہمیت اور اختیارات نہیں جتنے ہونے چاہییں۔

ان کا کہنا تھا کہ وہ اس آئینِ پاکستان کو تسلیم کرتے ہیں جو مذہبی آزادی دیتا ہے لیکن اس میں ترامیم کر کے احمدی برادری کو اقلیت قرار دیے جانے کو تسلیم نہیں کرتے۔

'ہم لوگ اپنے آپ کو اقلیت تسلیم نہیں کرتے اور ہمیں پارلیمان نے ناجائز طور پر 1974 میں ترمیم کے ذریعے غیر مسلم قرار دیا۔'

وہ کہتے ہیں کہ 'ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کابینہ کے اجلاس میں احمدیوں کے بارے میں کیا بات کی گئی اور پھر ٹیلی ویژن پر آ کر وزیر نے کیا بات کی۔ اس سے انھیں تو کوئی فرق نہیں پڑا۔۔۔ ہمارے لوگ پہلے ہی غیر محفوظ ہیں اور اس معاملے

> **یہ معاملہ اس وقت زیر بحث آیا جب مقامی ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں سامنے آئیں کہ حکومت کی جانب سے احمدی برادری کو اقلیتی کمیشن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔**

کے بعد ہم مزید غیر محفوظ ہو گئے ہیں۔'

وہ کہتے ہیں کہ 'ہمارے خلاف پہلے ہی نفرت اور اشتعال انگیزی پائی جاتی ہے اور حکومتی عہدیداروں کی ان باتوں کی وجہ سے ان کو مزید ہوا مل گئی ہے۔'

ان کے مطابق ایسے مسائل صرف سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے اٹھائے جاتے ہیں۔ 'آئین کی جس شق کے مطابق ہمیں غیر مسلم قرار دیا گیا ہے اس میں یہ کہاں لکھا ہے کہ ہم (اقلیت ہونے کا) اعلان کریں۔ اس لیے ہم اس بات کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔'

حکومت احمدی برادری کی رضامندی یا پوچھے بغیر انھیں اقلیتی کمیشن میں شامل کر سکتی ہے؟

اس معاملے کے قانونی پہلوؤں پر گفتگو کرتے ہوئے ایڈووکیٹ اسد جمال کا کہنا ہے کہ آئین کا سب سے اعلیٰ اور بنیادی حصہ یہ ہے کہ سب سے پہلے پاکستان میں موجود ہر شخص کو اس کے بنیادی حقوق دیے جائیں۔

'حکومت کے چند وزرا نے کہا کہ وہ (احمدی) آئین کو نہیں مانتے، اس لیے انھیں وہ حقوق حاصل نہیں ہوں گے جو آئین کے تحت (اقلیتوں سمیت) تمام پاکستانیوں کو حاصل ہیں۔'

انھوں نے کہا کہ 'آئین کو نہ ماننے والے لوگوں کے بھی حقوق ہیں جو پورے کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔ اگر کوئی آئین کی شقوں سے اختلاف کرتا ہے تو پاکستان میں ایسا کوئی قانون موجود نہیں کہ اس کے خلاف کارروائی کی جائے۔'

اسد جمال اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ اقلیتی کمیشن کے پاس اتنے اختیارات نہیں ہیں۔

تاریخ دان یعقوب بنگش کے مطابق پاکستان میں سنہ 1990 سے کئی ایڈہاک اقلیتی کمیشنز کام کر رہے تھے تاکہ غیر مسلم آبادی کے حقوق کا تحفظ کیا جا سکے

'جس اقلیتی کمیشن پر یہ ساری بحث کی جا رہی ہے، وہ ایک نام نہاد کمیشن ہے جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے اور کمیشن صرف کاغذوں تک ہی محدود ہے۔ یہ کمیشن 1990 میں ایک ایگزیکٹو آرڈر کے تحت بنا تھا۔۔۔ ان کی بات یا مسائل آگے وزارت مذہبی امور تک پہنچانے کے لیے یہ کمیشن بنایا گیا تھا۔

'یہ قانونی بنیادوں پر بنا ہوا ادارہ نہیں ہے۔ انسانی حقوق کے قومی کمیشن کی قانونی حیثیت ہے لیکن اقلیتی کمیشن کی نہیں ہے۔'

انھوں نے بتایا کہ سنہ 2016 میں انسانی حقوق کے لیے نیشنل ایکشن پلان کے تحت حکومتِ پاکستان نے اقوام متحدہ سے معاہدہ کیا تھا کہ اقلیتی کمیشن کو قانون کے تحت قائم کیا

جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

انھوں نے مزید کہا کہ اختلاف رائے کی آزادی، مذہبی آزادی اور ضمیر کی آزادی کا بنیادی حق جو آئین پاکستان ہر شہری کو دیتا ہے اس کی بنیاد پر احمدی یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم صرف خود کو غیر مسلم قرار دینے والی شق کو نہیں مانتے اور باقی آئین کو مانتے ہیں۔ کیونکہ قانونی طور پر اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔

'آئین کی شقوں پر بحث کی جا سکتی ہے۔ اصولی طور پر جب ریاست پاکستان انھیں غیر مسلم قرار دیتی ہے تو حکومت کو چاہیے کہ وہ اقلیتوں سے جڑے ہر معاملے پر احمدیوں کو دعوت دیں۔'

اسد جمال کے مطابق 'جہاں تک بات ہے کہ کیا قانونی طور پر حکومت انھیں خود سے ایسے کمیشن یا اقلیتوں میں شمار کر سکتی ہے، تو ابھی تک ایسا کوئی قانون موجود نہیں ہے۔ لیکن اگر پارلیمان ایسا کوئی قانون منظور کرتی ہے تو پھر یہ کیا جا سکتا ہے، ورنہ نہیں۔'

اس معاملے پر صدر لاہور بار جی اے خان طارق نے بی بی سی سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کا ہر شہری پابند ہے کہ وہ آئین کو مانے اور اس پر عمل کرے۔

وہ کہتے ہیں 'آئین پاکستان نے احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا ہے اس لیے میرے خیال میں تو جو اقلیتوں کے حقوق ہیں وہ انھیں ملنے چاہییں لیکن اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ بھی خود کو اقلیت مانیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور اپنے آپ کو اقلیت کے طور پر تسلیم نہیں کرتے تو وہ کیسے اقلیتوں کی کسی سیٹ پر آ سکتے ہیں۔

'احمدی آئین کی شق میں مذہبی آزادی کی بات کرتے ہیں ہے تو انھیں یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ جب انھیں غیر مسلم قرار دیا گیا تھا تو آئین میں ہی ان کی مذہبی رسومات کے حوالے سے کوڈ آف کنڈکٹ بھی بتایا گیا تھا۔ جس میں یہ باتیں شامل تھیں کہ یہ اپنی عبادت گاہ کو مسجد نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی واضح کی گئی کہ ان کا عبادت کا طریقہ کار مسلمانوں سے ملتا جلتا ہوگا لیکن اس کے باوجود بھی یہ اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتے۔'

انھوں نے مزید کہا کہ 'جب تک احمدی آئین کے مطابق اپنے آپ کو غیر مسلم نہیں مانتے تب تک وہ کیسے اسی آئین کی حقوق مانگ سکتے ہیں۔'

'تاہم قانونی طور پر دیکھا جائے تو اگر کوئی بھی شخص جو آئین کو تسلیم نہیں کرتا تو اس کے خلاف فوجداری قوانین موجود ہیں اور آئین پاکستان میں بھی ایسے شخص کو غدار کہا گیا ہے جو آئین کی کسی بھی شق سے انکار کرتا ہے۔'

اقلیتی کمیشن کب اور کیوں بنایا گیا تھا؟

اگر کسی اقلیت کو مسائل یا امتیازی سلوک کا سامنا ہے تو وہ اپنی شکایات لے کر اس کمیشن کے پاس آ سکتی ہیں۔

تاہم اس اقلیتی کمیشن کے پاس اس بات کا اختیار موجود نہیں ہے کہ وہ اقلیتوں کے حوالے سے کوئی فیصلہ خود سے لے سکے۔ اگر انھیں اقلیتوں کے حوالے سے کوئی بھی فیصلہ کرنا ہوگا تو وہ اپنی سفارشات وفاقی اور صوبائی حکومتوں کو بھجوائیں گے۔

اگر اقلیتوں کی طرف سے کوئی شکایت آتی ہے تو اس کے حل کے لیے بھی کمیشن کو پہلے متعلقہ محکمے کو بتانا ہوگا تا کہ اس کے حل کے لیے کوئی اقدام اٹھایا جا سکے۔ تاہم اس کمیشن کی کارکردگی، اختیارات، کام کے طریقہ کار اور اس کے وجود پر بہت سے لوگوں کو اب بھی اعتراضات ہیں۔ (بشکریہ بی بی سی اردو)

کوویڈ-19 کے دور میں انسانی حقوق کے محافظین کا کام: حکمت عملیاں اور مشکلات

کوویڈ-19 کی وباء کے سطح اور شدت کو عالمی ادارہ صحت نے صحت عامہ کا بحران قرار دیا ہے۔ ایک ایسا بحران جس نے دنیا بھر میں انسانی حقوق کے محافظین (ایچ آر ڈیز) کے کام کے لیے نئی مشکلات کو جنم دیا ہے۔

انسانی حقوق کے عالمی قانون کی رو سے، صحت عامہ کے بحران جیسی صورتحال کے دوران بعض حقوق پر محدود اور معین مدت کے لیے پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں، ایسی پابندیاں جو قرنطینہ کے اطلاق کا نتیجہ ہوتی ہیں اور نقل و حرکت کو محدود کرتی ہیں۔ البتہ، بحران پر مؤثر ردعمل کے لیے عدم امتیاز، شفافیت اور انسانی وقار کے احترام جیسے انسانی حقوق پر توجہ انتہائی ضروری ہے۔ صحت کے حق کے تحفظ کے لیے، حکومتیں کرونا وائرس کے متعلق درست اور تازہ ترین معلومات، سہولیات کی دستیابی، سہولیات کی دستیابی میں پائے جانے والے مسائل بشمول مریضوں کے متعلق درست اعداد و شمار، اور معائنے کی سہولیات اور دستیاب وسائل فراہم کرنے کی پابند ہیں۔

وباء پر پاکستان وباء کے ردعمل میں جو اقدامات کیے ہیں اُن کی بدولت کئی پسے ہوئے طبقے خطرات سے دوچار ہو گئے ہیں۔ دہاڑی دار مزدوروں، قیدیوں، طبی عملے اور صحافیوں سمیت مختلف گروہوں کی طبی نگہداشت اور مناسب حفاظتی ساز و سامان تک غیر مساوی رسائی نے اُنہیں مرض کے خطرے سے دوچار کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ، پاکستان میں غربت کی لکیر سے نیچے رہنے والے (لگ بھگ آبادی کا 2 فیصد، اور توقع ہے کہ اس میں اضافہ ہوگا) ابتدائی ملک گیر لاک ڈاؤن سے شدید متاثر ہوئے ہیں۔

ایچ آر سی پی کے خیال میں ایچ آر ڈیز کے لیے بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے وسائل اور کام کا دائرہ کار بڑھانے کے لیے درکار حکمت عملیوں پر سوچ بچار کریں۔ اس مقصد کے لیے ہم نے آن لائن اجلاسوں کا ایک سلسلہ شروع کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ ہر اجلاس ایک مخصوص موضوع پر ہوگا اور ان میں ایچ آر ڈیز بحران کے دوران پسماندہ اور درماندہ حال طبقوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے تبادلہ خیال کریں گے۔

ان آن لائن اجلاسوں کے مقاصد درج ذیل ہیں:

☆ ایچ آر ڈیز کے لیے محفوظ فضا قائم کرنا جس میں وہ انسانی حقوق بشمول انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کو مدنظر رکھتے ہوئے کوویڈ-19 کے اثرات پر ردعمل کے بارے میں گفتگو کر سکیں۔

☆ ایسے گروہوں کو جوڑنا جو وباء کے تناظر میں پسماندہ طبقوں کی مدد کے لیے اپنے موجودہ اور مستقبل کے کام کو یکجا کر سکیں۔

یہ اجلاس بذریعہ زوم منعقد ہوں گے اور ہر اجلاس سے دو دن قبل تمام شرکاء کو ایک آن لائن دعوت نامہ بھیجا جائے گا۔

ہم آپ کی شرکت کے متمنی ہیں۔

فرح ضیاء

ڈائریکٹر ایچ آر سی پی

یکم جون 2020

ملک میں سال کی پہلی سہ ماہی میں خواتین پر تشدد میں 360 فیصد تک اضافہ

خواتین وبچوں کے حقوق سمیت دیگر انسانی حقوق پر کام کرنے والی سماجی تنظیم ادارہ برائے پائیدار سماجی ترقی (ایس ایس ڈی او) کی تازہ رپورٹ کے مطابق سال 2020 کی پہلی سہ ماہی کے دوران پاکستان بھر میں خواتین وبچوں پر تشدد سمیت اغوا اور قتل کے واقعات میں 360 فیصد تک کا اضافہ دیکھا گیا۔

تنظیم کی جانب سے جاری کردہ پہلی سہ ماہی کی رپورٹ ملک کے معروف انگریزی و اردو اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کے ڈیٹا سے بنائی گئی اور تنظیم نے ملک کے 6 بڑے اخبارات کا 3 ماہ تک جائزہ لیا۔

مجموعی طور پر رپورٹ میں 8 مسائل کا جائزہ لیا گیا جن میں بچوں پر تشدد، اغوا، خواتین پر تشدد، ریپ اور جنسی استحصال، قتل، گھریلو تشدد، کم عمری کی شادیاں اور چائلڈ لیبر جیسے مسائل شامل تھے۔

تنظیم نے جنوری سے مارچ کے اختتام تک اخبارات میں شائع رپورٹس کا ڈیٹا جمع کرکے ان کے نتائج جاری کیے، جن سے معلوم ہوا کہ ملک بھر میں سال 2020 کی پہلی سہ ماہی کے دوران ہر طرح کے تشدد اور جرائم میں اضافہ دیکھا گیا تاہم گزشتہ 3 ماہ کے دوران کچھ دنوں میں جرائم میں کمی بھی نوٹ کی گئی۔

مذکورہ تنظیم ہر سہ ماہی پر رپورٹ جاری کرتی ہے اور اس بار شائع کی گئی رپورٹ کو کورونا وائرس سے نہیں جوڑا گیا اور نہ ہی رپورٹ میں جرائم کے اضافے کو وبا کے تناظر میں دیکھا گیا۔

رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر پہلی سہ ماہی میں خواتین و بچوں پر تشدد، ان کے قتل، اغوا اور ریپ جیسے واقعات میں اضافہ ہوا، تاہم فروری میں ایسے واقعات میں 73 فیصد تک کمی دیکھی گئی۔

رپورٹ کے مطابق مجموعی طور پر پہلی سہ ماہی میں مذکورہ 6 مسائل کے جرائم میں مارچ میں بے تحاشہ اضافہ دیکھا گیا اور مارچ میں ان جرائم میں 360 فیصد تک اضافہ ریکارڈ کیا گیا اور اوسط پہلی سہ ماہی میں خواتین اور بچوں پر تشدد میں 200 فیصد اضافہ دیکھا گیا۔

بچوں کا استحصال

رپورٹ کے مطابق پہلی سہ ماہی کے دوران ملک بھر میں بچوں کے استحصال میں اضافہ دیکھا گیا اور مجموعی طور پر سب سے زیادہ واقعات 61 مارچ میں پیش آئے جب کہ فروری میں بچوں کے استحصال کے 13 واقعات رپورٹ ہوئے۔

رپورٹ میں بتایا گیا کہ یہ وہ واقعات ہیں جو اخبارات میں شائع ہوئے جب کہ رپورٹس نہ ہونے والے واقعات کی تعداد ان سے کہیں زیادہ ہو سکتی ہے۔

مذکورہ تنظیم ہر سہ ماہی پر رپورٹ جاری کرتی ہے اور اس بار شائع کی گئی رپورٹ کو کورونا وائرس سے نہیں جوڑا گیا اور نہ ہی رپورٹ میں جرائم کے اضافے کو وبا کے تناظر میں دیکھا گیا۔

اسی طرح پہلی سہ ماہی کے دوران چائلڈ لیبر میں بھی اضافہ دیکھا گیا تاہم 3 ماہ کے دوران چائلڈ لیبر کی خلاف ورزی کے صرف 6 کیسز ہی رپورٹ ہو سکے۔

گھریلو تشدد

رپورٹ میں بتایا گیا کہ گھریلو تشدد کے واقعات میں پہلی سہ ماہی کے دوران 230 فیصد تک اضافہ دیکھا گیا اور سب سے زیادہ کیسز مارچ میں رپورٹ ہوئے جن کی تعداد 20 تھی، فروری میں ملک بھر میں گھریلو تشدد کے 6 کیس رپورٹ ہوئے۔

جنسی تشدد اور ہراسانی

رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں پہلی سہ ماہی کے دوران کام کی جگہوں پر ہراسانی کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے اور سب سے زیادہ کیسز فروری میں 5 رپورٹ ہوئے، کام کی جگہوں پر ہراسانی کے 2 کیسز مارچ اور ایک کیس جنوری میں رپورٹ ہوا۔

پہلی سہ ماہی کے دوران ریپ کے واقعات میں بھی اضافہ دیکھا گیا اور سب سے زیادہ کیسز مارچ میں 25 رپورٹ ہوئے جب کہ فروری میں بھی ریپ کے 24 اور جنوری میں 9 کیس رپورٹ ہوئے۔

خواتین پر تشدد

ایس ایس ڈی او کی رپورٹ کے مطابق سال کی پہلی سہ ماہی کے دوران خواتین کے خلاف تشدد کے واقعات میں بھی اضافہ ہوا اور سب سے زیادہ کیسز مارچ میں رپورٹ ہوئے۔

رپورٹ کے مطابق خواتین پر تشدد کے کیسز میں فروری میں 73 فیصد تک کمی دیکھی گئی اور حیران کن طور پر فروری میں ایسا کوئی کیس رپورٹ نہیں ہوا، جب کہ جنوری میں خواتین پر تشدد کے 9 جب کہ مارچ میں 36 کیسز رپورٹ ہوئے۔

خواتین پر تشدد کے سب سے زیادہ کیسز صوبہ پنجاب میں سامنے آئے، جہاں کیسز کا تناسب 34 فیصد رہا جب کہ سندھ 8 فیصد کے ساتھ دوسرے اور خیبرپختونخوا 3 فیصد کے ساتھ تیسرے نمبر پر رہا۔

بلوچستان سے خواتین پر تشدد کے واقعات رپورٹ ہی نہیں ہوئے۔

رپورٹ میں اغوا اور قتل و غارت کے واقعات میں اضافے کا ذکر بھی کیا گیا اور مجموعی طور پر پہلی سہ ماہی میں سب سے زیادہ جرائم مارچ میں رپورٹ ہوئے اور مارچ میں جرائم میں 360 فیصد تک اضافہ دیکھا گیا۔

(بشکریہ ڈان)

زبان کی پابندی سے احتیاط کیجیے، بچہ جس زبان میں چاہے پڑھنے دیجیے!

زبیدہ مصطفیٰ

تدریسی زبان ہمیشہ سے ایک حل طلب مسئلہ رہا ہے اور حالیہ دنوں میں یہ ایک بار پھر گرما گرم بحث کا موضوع بن چکا ہے۔ مگر اب چونکہ مادری زبان کی حامی لابی گزشتہ برسوں میں مضبوط ہوئی ہے، اس لیے ان کی آواز سنی جارہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زبان سے پیدا ہونے والے جذبات کو کبھی بھی دبایا نہیں جاسکتا۔

تو اس بار اس تنازع کو کس نے جنم دیا؟ اس کے پیچھے قومی نصاب کونسل کی ذیلی کمیٹی کی جانب سے تیار کردہ رپورٹ تھی۔ بعدازاں اس کونسل کے ایک رکن نے اسے 'غلط اطلاعات پر مبنی' رپورٹ قرار دیا۔

غلط کہی جانے والی اس رپورٹ نے پرائمری سے 12ویں تک کے چند مضامین کے لیے انگریزی زبان کو بطور تدریسی زبان استعمال کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ رپورٹ میں مقامی زبانوں کو مکمل طور پر خارج کردیا گیا تھا، جس پر سوشل میڈیا پر ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور یہ بات قابلِ فہم بھی ہے۔ شکر ہے کہ کچھ وقت بعد حکومت نے ایک وضاحت جاری کرتے ہوئے کہا کہ تدریسی زبانوں کا معاملہ صوبائی حکومتوں پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اس کے باوجود بھی آپ اس معاملے پر مطمئن نہیں ہوسکتے کیونکہ سندھ کو چھوڑ کر تمام ہی صوبوں نے 18ویں ترمیم کے تحت شعبہ تعلیم سے متعلق ملنے والے حقوق کو وفاقی حکومت کے حق میں دستبردار کردیے۔ تعلیم کو انگریزیت اور مرکزیت کی طرف موڑنے سے متعلق پاکستان تحریک انصاف (پی ٹی آئی) کے ارادوں سے تو سبھی واقف ہوں گے۔

میں یہاں ذیلی کمیٹی اور قومی نصاب کونسل کی توجہ اس جانب دلانا چاہوں گی کہ صوبائی زبانوں میں پڑھانا واحد مسئلہ نہیں ہے۔ اہم معاملہ پرائمری سطح پر سائنس کے مضمون سمیت تمام مضامین کو پڑھانے کے لیے مادری زبان کا استعمال ہے۔ انگریزی کو بطور ایک مضمون پڑھانا تو ٹھیک ہے لیکن اسے تدریسی زبان کے طور پر استعمال بے وقوفی ہے۔

مادری زبان کو تدریسی زبان کا درجہ دینے کے معاملے پر پوری دنیا کے ماہرین نے اطمینان بخش دلائل پیش کیے ہیں، جسے میں یہاں مختصراً بیان کرنا چاہوں گی۔

بچہ اپنی مادری زبان فطری طور پر گھر کے ماحول پھر گھر سے باہر اردگرد کے ماحول سے سیکھتا ہے۔ بچے کو زبان سکھانا نہیں پڑتی بلکہ ذہنی عقل وشعور کی فطری نمو کے ساتھ ساتھ وہ خودبخود اپنی مادری زبان سیکھ جاتا ہے۔ یہ عمل پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہوجاتا ہے اور اگلے 6 سے 7 برسوں کے لیے جاری رہتا ہے کیونکہ اس دوران بچہ سیلف ایجوکیشن کے عمل کے ذریعے نئی نئی چیزوں کو سیکھ رہا ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ماہرینِ تعلیم اس بات کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہی ایک ہیں جو بچوں کو پڑھانے کا حق رکھتے ہیں۔ بچوں کو 2 سے 5 برس کی عمر میں جیسے ہی اسکول میں داخلہ دلوایا جاتا ہے تو ان کا خود سے سیکھنے کا تجربہ دفن کردیا جاتا ہے اور اس وقت وہ بچہ جس زبان کو روانی سے بولنے کی صلاحیت رکھتا ہے اسے یکسر نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

اسکول میں بچے کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ واقعی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے تو اسے ایک خاص زبان لازماً سیکھنی پڑے گی جو اس کے لیے اجنبی ہوتی ہے (90 فیصد سے زائد بچوں کے لیے اردو ایک اجنبی زبان ہے)۔

جب میں نے بچوں کو پتھر کے پیچھے چھپی تاریخ بتانی شروع کی تو انہوں نے کافی احتجاج کیا اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں یہ تاریخ اردو میں بتاؤں۔ جب اردو میں تاریخ بتانی شروع کی تب وہ گفتگو سے کافی محظوظ ہورہے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر فائدہ یہ ہوا کہ وہ بچے بآسانی اپنی سوچ اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کر پارہے تھے اور اسی اظہار کے لیے میں ان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی ہوں۔

پھر کیا ہوتا ہے؟ سب سے پہلے تو بچہ تعلیم اور اسکول میں دلچسپی کھو بیٹھتا ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ اردگرد موجود لوگوں میں تنہا کردیا جاتا ہے، کیونکہ اساتذہ اور دیگر بچے وہ زبان استعمال نہیں کررہے ہوتے یا پھر اس زبان کے استعمال کی اجازت نہیں دی جاتی جسے وہ بچہ سمجھتا ہے۔ تیسرا یہ کہ وہ اپنی زبان بھولنے لگتا ہے۔ نتیجتاً بچہ 'نئے' اور 'اجنبی' لوگوں سے ایک 'نئی' اور 'اجنبی' زبان پر عبور حاصل کرنے میں ناکامی کے ساتھ ہی کسی بھی موضوع پر سوچنے کی طاقت وصلاحیت سے محروم ہوتا جاتا ہے۔

یہ عمل اسے 'بے زبان' اور رٹے باز طالب علم بنا دیتا ہے۔ اسی بات سے ہمیں اندازہ ہوجانا چاہیے کہ اسکولوں میں قدرے 'اچھی' تعلیم کی فراہمی کے باوجود بھی ہمارے بچوں

میں حصولِ علم کی کمزوری کی وجہ کیا ہے۔

ان دنوں میں جن 3 چھوٹے لڑکوں کو پڑھا رہی ہوں انہی کی مثال لیجیے۔ 11 سے 13 برس کی عمر کے ان بچوں کو بظاہر انگریزی میں تعلیم دی جارہی ہے۔ میں نے جب ان سے پوچھا کہ آپ سے مخاطب ہونے کے لیے میں کون سی زبان استعمال کروں تو انہوں نے یک آواز ہوکر کہا 'انگریزی' اور آگے یہ بھی کہا کہ 'ہم اپنی انگریزی بہتر کرنا چاہتے ہیں۔'

جب میں نے اپنے پرس سے ایک چھوٹا سا پتھر نکالا تو بچوں کی اس میں کافی دلچسپی پیدا ہوئی، دراصل 1990ء میں جب میرا برلن جانا ہوا تب وہاں گرائی گئی دیوار برلن کا ملبہ بکھرا پڑا تھا، وہیں سے میں نے یہ پتھر اٹھایا تھا۔

جب میں نے بچوں کو پتھر کے پیچھے چھپی تاریخ بتانی شروع کی تو انہوں نے کافی احتجاج کیا اور مجھ سے مطالبہ کیا کہ میں یہ تاریخ اردو میں بتاؤں۔ جب اردو میں تاریخ بتانی شروع کی تب وہ گفتگو سے کافی محظوظ ہورہے تھے۔ اس سے بھی بڑھ کر فائدہ یہ ہوا کہ وہ بچے بآسانی اپنی سوچ اور اپنے خیالات کا اظہار بھی کر پارہے تھے اور اسی اظہار کے لیے میں ان کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتی ہوں۔ کلاس ختم ہونے سے پہلے انہوں نے دوسری جنگِ عظیم کی تاریخ کو بتانے کے لیے بغیر کسی تیاری کے ایک خاکہ پیش کیا۔

تو یہ ہے زبان کا جادو۔ زبان ہی 2 لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں مدد فراہم کرتی ہے۔ یہ زبان ہی اساتذہ کا طالب علموں کے ساتھ تعلق قائم کرتی ہے۔ وہ استاد جو یہ کہتا ہے کہ اگر استاد اچھا ہے تو زبان سے کوئی فرق نہیں پڑتا، غلط کہتا ہے۔ ایک استاد کو وہی زبان استعمال کرنی چاہیے جو طالب علم بولتے ہیں۔ وہ استاد جو اس سادہ سی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا وہ یہ نہیں جانتا کہ تعلیم کو قابلِ لطف بنانے کے لیے شراکتی تعلیم لازمی ہے۔

جیلوں میں ملاقات پر پابندی قیدیوں کی بھوک ہڑتال

پشاور 28 مئی کو صوبہ بھر کی جیلوں میں دو مہینوں سے عزیز و اقارب سے ملاقات کی اجازت نہ دینے پر قیدیوں نے بھوک ہڑتال اور احتجاج شروع کر دیا ہے، رمضان المبارک، عید الفطر پر صوبے بھر کی جیلوں میں قیدیوں کی ملاقاتوں پر پابندی عائد تھی جو تاحال برقرار ہے۔ جیل خانہ جات ذرائع کے مطابق سنٹرل جیل پشاور، ڈیرہ اسماعیل خان، ہری پور، کوہاٹ، بنوں، سمیت تمام ڈسٹرکٹ جیلوں میں قیدی سراپا احتجاج بن گئے ہیں۔ قیدیوں نے موقف اختیار کیا ہے کہ ملاقاتوں پر عائد پابندی کو فوری طور پر ختم کیا جائے اور ایس او پیز کے تحت جیلوں میں ملاقات کی اجازت دی جائے، سنٹرل جیل پشاور میں قیدیوں نے بھوک ہڑتال بھی شروع کر دی ہے جبکہ جیل خانہ جات انتظامیہ احتجاج کرنے والے اور بھوک ہڑتال کرنے والے قیدیوں کو یقین دہانی کرا رہے ہیں کہ صوبائی حکومت کی جانب سے عنقریب پابندی ختم کر دی جائے گی۔ جیلوں میں ملاقاتوں کیلئے ایس او پیز کی تیاری شروع کر دی ہے، جبکہ سنٹرل جیل پشاور کے باہر قیدیوں کے رشتہ دار بھی سراپا احتجاج ہیں، جس پر جیل کے باہر مزید پولیس نفری بھی تعینات کر دی گئی ہے۔

ٹیوب ویل خراب، پانی کا بحران سنگین

لکی مروت کو لکی شہر کے گنجان آباد محلّہ حقداد آباد میں ٹیوب ویل خرابی سے پینے کا پانی کا بحران سنگین صورت اختیار کر گیا، اہل علاقہ کا کہنا ہے کہ شہری علاقے کا واحد شفقت خان ٹیوب ویل کوئی ایک ہفتے سے خراب ہے جس سے رمضان المبارک کے دوران انہیں پینے و دیگر ضروریات کیلئے پانی کے حصول میں مشکلات درپیش ہیں، انہوں نے کہا کہ کم گھروں میں واٹر پمپ مشینیں نصب ہیں جبکہ زیادہ تر گھروں کو ٹیوب ویل سے پانی سپلائی کیا جاتا ہے، ٹیوب ویل کی خرابی سے وہ دن بھر روزے کی حالت میں حصول آب کیلئے سرگرداں رہتے ہیں یہی نہیں بلکہ پانی نہ ہونے سے خواتین کو امور خانہ داری نمٹانے مُیں بھی مشکلات کا سامنا ہے۔ تحصیل میونسپل ایڈمنسٹریشن کے شعبہ آب رسانی کے سربراہ حاجی انور کمال نے بتایا کہ ٹیوب ویل کی مشینری مکینک کے پاس پہنچا دی گئی ہے مرمت ہوتے ہی نصب کر کے ٹیوب ویل چالو کر دیا جائے گا، انہوں نے کہا کہ محلّہ حقداد آباد کو متبادل ذرائع سے فراہمی آب کی کوشش کی جا رہی ہے۔

(نامہ نگار)

آلودہ پانی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا

پشاور یونین کونسل بھانہ ماڑی می پینے کے آلودہ کا مسئلہ حل نہ ہو سکا، جس کی وجہ سے علاقہ میں مختلف وبائی امراض تیزی سے پھیلنے لگے ہیں بھانہ ماڑی کے علاقوں تیمر گڑھی، غیاث آباد، پیپلز کالونی، وہاب کوارٹرز، لطیف خان سرائے، محلّہ سحر گل، محلّہ غنی گل، میں گزشتہ کئی ماہ سے بوسیدہ پائپوں کی وجہ سے گھروں میں میں آلودہ پانی کی فراہمی جاری ہے جس کی وجہ سے علاقہ میں ٹائیفائیڈ سمی مختلف امراض پھیل رہے ہیں اور علاقہ کے لوگوں کی بڑی تعداد بیماری ہوتی جا رہی ہے، اس سلسلہ شکایت پر دو ہفتے قبل ڈبلیو ایس ایس پی کی ایک ٹیم سروے کیلئے آئی تھی جس نے صورتحال کا جائزہ لینے کے بعد پائپ تبدیل کرنے کا اعلان کیا تھا مگر تا حال اس سلسلہ میں کسی قسم کی کوئی پیشرفت نہیں ہو سکی ہے جس پر اہل علاقہ کی طرف سے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے معاون خصوصی برائے بلدیات کامران بنگش اور ڈبلیو ایس ایس پی کے فوکل پرسن حاجی شوکت علی سے فوری مداخلت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس سلسلہ میں جلد سے جلد عملی اقدامات کیے جائیں۔

(نامہ نگار)

عید پر قیدی اپنے پیاروں کی ملاقات محروم

پشاور ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کورونا وائرس کی وباء کے خلاف رواں سال عید الفطر پر جیلوں میں قیدی اپنے پیاروں سے ملاقاتیں نہیں کر سکیں گے، منگل کے روز بھی سنٹرل جیل پشاور کے باہر سینکڑوں خواتین، بچے، مرد موجود رہے جو کہ اپنے پیاروں سے ملاقات کیلئے آئے تھے، عبد الفطر کے لئے نئے کپڑے، مٹھائی سمیت دیگر اشیاء ساتھ لائے تھے تاہم جیل اہلکار اپنے منظور نظر افراد کو ملاقات کی اجازت دیتے رہے جبکہ دیگر قیدیوں کو یہ کہہ کر ٹرخا دیتے تھے کہ حکومت کی جانب سے ملاقاتوں پر پابندی عائد ہے، سنٹرل جیل پشاور کے باہر ملاقاتوں پر عائد پابندی ختم کرنے کے لئے احتجاج معمول بن گیا ہے، رشتہ داروں نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ جیلوں میں ملاقاتوں پر عائد پابندی فوری طور پر ختم کی جائے، گزشتہ ڈیڑھ مہینوں سے وہ اپنے پیاروں سے نہیں ملے ہیں اور نا ہی انہیں اپنے پیاروں کا پتہ ہے۔

(روزنامہ آج)

شوہر کے تشدد سے بیوی جاں بحق

پشاور 22 مئی 2020ء کو بڈھ بیر کے علاقہ زنگلی میں شوہر نے تشدد کر کے بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، ملزم ارتکاب جرم کے بعد فرار ہو گیا، پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی۔ مدعی اختر گل سکنہ زنگلی بڈھ بیر نے اپنی والدہ مسماۃ منتظرہ بیوہ اختر گل کے ہمراہ پولیس سٹیشن بڈھ بیر میں رپورٹ کرائی کہ اس کی بہن مسماۃ گل نذیرہ کی شادی عمر علی عرف مراد سکنہ چار باغ سوات حال ٹیلہ بند کے ساتھ ہو چکی تھی جن سے دونوں کے پانچ بچے بھی ہیں، گزشتہ روز اسے چچا زاد بھائی نے اطلاع دی کہ اس کی بہن مر چکی ہے جب وہ ادھر گیا تو دیکھا کہ اس کی بہن مردہ حالت میں تھی اور اس کے بدن پر زخم کے نشان تھے، معلومات کرنے پر پتہ چلا کہ اس کی شوہر نے تشدد کر کے مارا ہے، پولیس نے اس کی رپورٹ پر مقدمہ درج کر کے مزید تفتیش شروع کر دی ہے اور لاش کو پوسٹ مارٹم کیلئے بھجوا دیا گیا ہے۔ (روزنامہ آج)

لاپتہ ہونیوالے بچے کی لاش کنویں سے برآمد

نوشہرہ مانکی شریف میں تین سال قبل لاپتہ ہونے والے سات سالہ بچے کی لاش کنویں سے برآمد کر لی گئی۔ پولیس کے مطابق مبینہ طور پر سات سالہ بچی عبداللہ تین سال قبل اپنی ماں کے ساتھ شیدو سے شادی میں شرکت کیلئے مانکی شریف آیا تھا اور لاپتہ ہو گیا تھا، بچے کو مبینہ طور پر ایک خاتون نے قتل کر کے لاش گھر کے کنویں میں پھینک دی تھی۔ (نامہ نگار)

5 سالہ بچے کو تشدد کر کے قتل کر دیا گیا

لکی مروت 27 مئی کو تجوڑی کے علاقے کوٹکہ الی زر بائیگان میں مبینہ طور پر نامعلوم افراد نے 5 سالہ بچے پر تشدد کر کے قتل کر دیا۔ اس سلسلے میں تجوڑی پولیس نے میڈیا کے نمائندوں کو بتایا کہ برکت اللہ سکنی جبار بیٹنی نے اپنی مدعیت میں ایف آئی آر درج کراتے ہوئے پولیس کو بتایا کہ ان کا پانچ سالہ بیٹا نوید اللہ آج بروز بدھ گھر سے نکلا اور سہ پہر گھر سے تقریباً 1 کلومیٹر کے فاصلے پر بیٹے کی لاش ملی جس کو نامعلوم افراد نے تشدد کر کے قتل کیا۔ پولیس نے نامعلوم افراد کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔ (نامہ نگار)

☆ انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات کی رپورٹ

1-وقوعہ کیا تھا:							
2-وقوعہ کب ہوا؟	سال				مہینہ		تاریخ

3-وقوعہ کہاں ہوا؟	گاؤں	محلّہ
	ڈاک خانہ	تحصیل وضلع
4- کیا وقوعہ کا مقامی رسم ورواج سے تعلق ہے	ہاں	نہیں
5-وقوعہ کیسے ہوا؟ (مختصر تفصیل)		

6-وقوعہ کا ماضی کے کسی دوسرے واقعہ سے تعلق اور اس کی مختصر تفصیل

7-وقوعہ کا شکار ہونے والے کے کوائف	نام	ولد/زوجہ	پیشہ

8-وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے معاشی/سماجی حیثیت	بچہ/بچی	عورت/مرد	غریب/ان پڑھ	بوڑھا/بوڑھی	بیمار
	مخالف سیاسی کارکن	سماجی کارکن	اقلیتی فرقے کا رکن	دیگر (تخصیص کریں)	

9-وقوعہ میں ملوث اشخاص کے کوائف:	نام	ولدیت/زوجیت	عہدہ	پیشہ
	-1			
	-2			
	-3			

10-وقوعہ کے ذمہ دار فرد/افراد کی معاشی/سماجی حیثیت	بڑا جاگیردار/زمیندار/بہت امیر آدمی	متوسط طبقے سے/غریب آدمی	بااثر صلاحیت/سیاسی اثر ورسوخ

11-وقوعہ کی پشت پناہی کرنے والے عناصر کے کوائف	نام اور ولدیت	عہدہ	پیشہ	پارٹی/ادارہ
	-1			
	-2			
	-3			

12-وقوعہ سے متعلقہ فریقین گواہان وغیر جانبدار افراد کے کوائف وموقف

وقوعہ سے تعلق	نام اور ولدیت	وقوعہ سے متاثر ہونے والے کے ساتھ تعلق/رشتہ داری	عہدہ	موقف
واقعہ سے متاثر				
واقعہ کا ذمہ دار				
چشم دید گواہ				
غیر جانبدار/پڑوسی				

13-اس قسم کے واقعات علاقہ میں کس قدر ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں	بہت زیادہ	اکثر اوقات	کبھی کبھار	کبھی نہیں
14-اس قسم کے واقعات اندازاً کتنی تعداد میں ہوتے ہیں	روزانہ	ماہانہ	سالانہ	

15-وقوعہ کے بارے میں HRCP نامہ نگار/اس کے ساتھ چھان بین کرنے والے/والوں کی رائے

رپورٹ بھیجنے والے کے کوائف:	نام	پتہ: گاؤں/محلّہ	شہر/ضلع

انسانی حقوق کے عالمی منشور کی کس شق کی خلاف ورزی ہوئی؟

دستخط: ....

تاریخ: ....

نوٹ: اگر تفصیلات فارم پر نہ آسکیں تو نمبر لکھ کر سادے کاغذ پر تفصیل درج کریں

☆ تمام ساتھی جو انسانی حقوق کے حوالے سے رپورٹیں بھیجتے ہیں آئندہ اس فارم کی فوٹو کاپی پر کوائف پُر کر کے بھیجیں۔

جون

انسانی حقوق کے عالمی دن

یکم جون	والدین کا عالمی دن
4 جون	جارحیت سے متاثرہ معصوم بچوں کا عالمی دن
5 جون	ماحول کا عالمی دن (یو این ای پی)
8 جون	سمندروں کا عالمی دن
12 جون	چائلڈ لیبر کے خلاف عالمی دن
14 جون	خون کا عطیہ دینے والوں کا عالمی دن (ڈبلیو ایچ او)
15 جون	بزرگوں سے ناروا سلوک سے آگاہی کا عالمی دن
17 جون	زمین کے صحرا بُر دھونے اور خشک سالی پر قابو پانے کا عالمی دن
20 جون	مہاجرین کا عالمی دن
23 جون	اقوام متحدہ کا خدمات عامہ کا دن
23 جون	بیواؤں کا عالمی دن
25 جون	ملاحوں کا عالمی دن (آئی ایم او)
26 جون	ادویات کے غلط استعمال اور غیر قانونی نقل وحمل کے خلاف عالمی دن
26 جون	تشدد کے متاثرین کی حمایت میں اقوام متحدہ کا عالمی دن

HRCP

پبلشر: ندیم فاضل: پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق
”ایوان جمہور“ 107۔ٹیپو بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور
فون: 35838341-35864994 فیکس: 35883582
ای میل hrcp@hrcp-web.org ویب سائٹ: www.hrcp-web.org
پرنٹر: مکتبہ جدید پریس، 14 ایمپرس، لاہور Registered No. LRL-15